درسِ نظامی

وفاق المدارس العربیہ کے نصاب کا تنقیدی جائزہ

پسِ منظر، تجزیہ اور سفارشات

پیس ایجوکیشن اینڈ ڈویلپمنٹ (پیڈ) فاؤنڈیشن

DISCLAIMER

پیڈ فاؤنڈیشن نے اس رپورٹ کو مرتب کرنے کی ذمہ داری مستند تحقیقی ٹیم کو سونپی ہے اور اس رپورٹ میں پیش کیے گئے حقائق، تجزیے اور سفارشات کو مکمل تحقیق کے بعد مرتب کیا گیا ہے، تاہم نادانستہ طور پر کسی بھی تحقیقی سقم اور کمی پائے جانے پر ادارہ ذمہ دار نہیں ہوگا۔

درسِ نظامی

(وفاق المدارس العربیہ کا نصاب)

پس منظر، نصاب، سفارشات

پیس ایجوکیشن اینڈ ڈویلپمنٹ (پیڈ) فاؤنڈیشن

جائزہ کمیٹی

۱۔ڈاکٹر محمد خالد مسعود، سابق چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد

۲۔مفتی محمد زاہد، نائب مہتمم، جامعہ امدادیہ، فیصل آباد

۳۔حافظ عمار خان ناصر، ایڈیٹر ''الشریعہ''، نائب ناظم، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ

۴۔مفتی عبد القوی، مہتمم جامعہ عبیدیہ، ملتان

۵۔خورشید احمد ندیم، چیئرمین، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد

تجزیہ

۱۔مفتی محمد زاہد، نائب مہتمم، جامعہ امدادیہ، فیصل آباد

۲۔حافظ عمار خان ناصر، ایڈیٹر ''الشریعہ''، نائب ناظم، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ

۳۔خورشید احمد ندیم، چیرمین، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد

ایڈیٹر

خورشید احمد ندیم، چیئرمین، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد

پیس ایجوکیشن اینڈ ڈویلپمنٹ (پیڈ) فاؤنڈیشن

پیش لفظ

پاکستان میں مدارس کا کردار گزشتہ ایک دہائی کے دوران انتہائی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔مختلف مکاتب فکر اس حوالے سے مختلف اور متضاد قسم کی رائے رکھتے ہیں۔ایک جانب وہ طبقہ ہے جو پاکستان میں امن وعامہ کی صورتحال سے متعلق مدارس کے کردار پر شکوک شبہات رکھتا ہے اور ان کو بیشتر مسائل کا ذمہ دار ٹھراتا ہے۔دوسری جانب وہ دینی حلقے ہیں جن کا نکتہ نظر یہ ہے کہ مدارس پر تمام تر تنقید ایک مخصوص لابی کے زیر اثر کی جارہی ہے۔

پیڈ فاؤنڈیشن اس حلقہ فکر سے تعلق رکھتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس پاکستان کے تعلیمی نظام میں بہر طور ایک کردار ادا کر رہے ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مدارس پر اٹھائے جانے والے بیشتر سوالات عموماً تحقیق سے عاری ہیں۔مدارس پر اٹھائے گئے سوالات میں سب سے اہم سوال دینی مدارس کے نصاب سے متعلق ہے۔دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی بحث کئی دہائیوں سے جاری ہے مثلاً سابق صدر پرویز مشرف کے دور میں بھی مدارس اصلاحات کا عمل شروع کیا گیا،لیکن اس اہم عمل میں بھی تحقیق کو نظر انداز کیا گیا۔وفاق المدارس میں جاری نصاب جیسے درس نظامی کے نام سے جانا جاتا ہے کے حوالے سے پیڈ فاؤنڈیشن کے زیر نگرانی یہ مطالعہ اس تحقیقی خلا کو پر کرنے کے حوالے سے ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔

اس تحقیق کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی ہے کہ موضوع بحث کی معلومات کے بغیر کی جانے والی بحث لا حاصل رہے گی۔اس تحقیق سے نہ صرف دینی مدارس بلکہ علمائے کرام،حکومتی ادارے اور درس وتدریس سے تعلق رکھنے والے محققین بھی استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔اس مطالعے کا مقصد ہرگز دینی مدارس کے نصاب کو تنقید کا نشانہ بنانا نہیں۔

پیڈ فاؤنڈیشن دینی مدارس کے معاشرتی کردار کو اہم گردانتے ہوئے یہ سمجھتی ہے کہ مدارس میں کسی قسم کی تبدیلی کا منبع اندرونی عوامل پر ہی مشتمل ہونا چاہیئے۔پیڈ فاؤنڈیشن اس تحقیقی مطالعے کو اس امید اور خلوص نیت سے پیش کر رہی ہے کہ حلقہ احباب اس پر پر مغز بحث کر سکیں اور دینی مدارس میں جاری نصاب کے حوالے سے ان سفارشات سے

استفادہ حاصل کرسکیں جونہایت تفصیل سے پیش کی گئیں ہیں۔

پیڈ فاؤنڈیشن جناب خورشید احمد ندیم کی نہایت مشکور ہے جنہوں نے اس اہم تحقیقی عمل کے لئے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ ادارہ ڈاکٹر محمد خالد مسعود صاحب، سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، کا بھی شکریہ ادا کرتی ہے جنہوں نے نہ صرف اس مطالعے کے جائزے میں مدد فراہم کی بلکہ اس کی حدود و قیود کے تعین میں بھی مدد کی۔ پیڈ فاؤنڈیشن مفتی محمد زاہد، نائب مہتمم، جامعہ امدادیہ، فیصل آباد، حافظ عمار خان ناصر، ایڈیٹر ''الشریعہ''، نائب ناظم، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ، مفتی عبدالقوی، مہتمم جامعہ عبیدیہ، ملتان کی بھی مشکور ہے جنہوں نے اس تحقیق میں اہم کردار ادا کیا۔

پیڈ فاؤنڈیشن اس رپورٹ کے حوالے سے آراء اور تجاویز کا خیر مقدم کرے گی اور ان تجاویز سے استفادہ کرتے ہوئے اس رپورٹ کو زیادہ جامع اور سودمند بنا سکے گی۔

ثمینہ امتیاز
ایگزیکٹیو ڈائریکٹر
پیڈ فاؤنڈیشن

فہرست

خلاصہ 06

ابتدائیہ 08

بابِ اوّل 13

درسِ نظامی (وفاق المدارس العربیہ) تاریخ، پس منظر، نصاب 13

وفاق المدارس کا قیام 25

بابِ دوم 46

درسِ نظامی (وفاق المدارس) نصاب کا تنقیدی جائزہ 46

بابِ سوم 85

سفارشات دینی نظامِ تعلیم کے اہداف 85

نصاب سازی 88

مراجع ومصادر 94

تجزیاتی مطالعات 95

خلاصہ

پاکستان کے دینی مدارس میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے، یہ کم وبیش وہی ہے جو نوآبادیاتی دور سے پہلے مسلم ہندوستان کا عمومی تعلیمی نصاب تھا۔ اس میں دینی علوم کے ساتھ غیر دینی علوم کی تدریس بھی کی جاتی تھی۔ انگریزوں کی آمد کے بعد، روایتی اہلِ علم کے ایک گروہ نے یہ خیال کیا کہ مسلم تہذیب کے تحفظ کے لیے، موجود حالات میں سب سے بہتر حکمت عملی یہ ہے کہ قدیم علمی ورثے کی حفاظت کی جائے، جسے ان کے خیال میں انگریزوں کی سیاسی اور علمی برتری سے خطرات لاحق تھے۔ اس مقصد کے لیے 1866 میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی اور اس درس نظامی کو اپنا لیا گیا جو اٹھارویں صدی کے ایک عالم ملا نظام الدین سہالوی (م 1748) سے منسوب ہے اور پہلے سے رائج تھا۔

انیسویں صدی میں مسلمان علماء کے مابین کلامی وفقہی اختلافات کے پیش نظر، مختلف مکاتبِ فکر نے اپنے منفرد دینی تشخص کو برقرار رکھنا چاہا۔ دیوبندی علماء سے الگ دینی رجحانات رکھنے والے حنفی علما، بریلوی مسلک سے منسوب ہوئے۔ اسی طرح اہل حدیث علما نے اہل ظاہر اور سلفی روایت کو آگے بڑھایا۔ تاہم اہلِ سنت کے ان سب مسالک کے دینی مدارس میں چند ترامیم کے ساتھ درس نظامی ہی کو اختیار کیا گیا۔

تقسیمِ ہند کے بعد 1959 میں، دیوبند مسلک کے مدارس نے پاکستان میں 'وفاق المدارس العربیہ' کے نام سے ایک تنظیم بنائی جس کا مقصد دیوبندی مدارس کے نصاب اور دیگر سرگرمیوں کو ایک نظم کے تابع کرنا تھا۔ مدارس کے اس جدید نظام میں بھی درسِ نظامی کے اس قدیم نصاب ہی کو جاری رکھا گیا جو تقسیم سے پہلے رائج تھا۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی بھی لائی جاتی رہی۔ آخری بڑی تبدیلی 2003 میں آئی جب بعض نئے مضامین شاملِ نصاب ہوئے۔ اس کے علاوہ پہلے سے پڑھائے جانے والے مضامین کی نصاب میں بعض نئی کتب کو بھی شامل کیا گیا۔

زیرِ نظر رپورٹ میں وفاق المدارس کے نصاب کے تاریخی پس منظر کے ساتھ ان تبدیلیوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو نصاب میں وقتاً فوقتاً کی جاتی رہیں۔ اس کے ساتھ اسلامی علوم میں سامنے آنے والی نئی تحقیقات اور موضوعات کو پیش

نظر رکھتے ہوئے، ان میں بہتری کے لیے سفارشات بھی اس رپورٹ کا حصہ ہیں۔ یہ مطالعہ وفاق المدارس کے نصاب تک محدود ہے اور اس میں دیگر مکاتب فکر کے زیر اہتمام قائم مدارس کے نصاب کا جائزہ شامل نہیں ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ پاکستان میں 65 فیصد مدارس کا تعلق دیوبند مسلک سے ہے اور ان میں سے اکثر وفاق المدارس کے نظم ہی سے وابستہ ہیں۔

نصاب کی بارے میں جو سفارشات پیش کی گئی ہیں، وہ قیامِ مدارس کے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہیں اور یہ دیکھا گیا ہے کہ موجودہ نصاب ان کے حصول میں کتنا معاون ہے۔ نیز ان مقاصد پر نظر ثانی کی بھی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ مختلف علوم کی تدریس میں کون سے خلا ہیں جنہیں پُر کرنا ضروری ہے۔ اس بات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے کہ اسلامی علوم میں آنے والے ارتقا اور نئی تحقیقات سے طلبہ وطالبات کو باخبر رکھنے کے لیے ان اداروں کے نصاب میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اس مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ موجودہ نصاب ان مباحث سے لاعلمی پر مبنی ہے جو دورِ جدید کے علمی چیلنج نے اٹھائی ہیں۔ ان کو مخاطب کیے بغیر مدارس کا نصاب ایک مسلم سماج کی علمی ضروریات سے پوری طرح عہدہ برا نہیں ہوسکتا۔ موجودہ عالمی نظام سیاست ومعیشت سے غیر مطابقت کی ایک بڑی وجہ لاعلمی بھی ہے جس کے باعث ایک مدرسے کا گریجویٹ جب عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اسے سماجی میل جول میں مشکل پیش آتی ہے۔ یوں وہ اپنے حلقے تک محدود ہو جاتا ہے۔ اس سے سماجی تقسیم مزید پختہ ہوتی ہے۔

چونکہ یہ مطالعہ وفاق المدارس کے نصاب کے جائزے تک محدود ہے، اس لیے دوسرے پہلوؤں سے دانستہ صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ سفارشات کا تعلق بھی صرف نصاب سے ہے۔ تاہم یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ مدارس کے سماجی اثرات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ ان کے تعلیمی ماحول اور غیر نصابی سرگرمیوں کو بھی اسی نوعیت کے مطالعے کا موضوع بنایا جائے۔ مدارس کے طلبہ وطالبات کے سماجی رویئے کی تشکیل میں اس ماحول کا گہرا اثر ہے جو ان مدارس میں انہیں فراہم کیا جاتا ہے۔ وہاں مختلف موضوعات کے تحت جو تقریبات ہوتی ہیں، وہ ذہن سازی میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس کے لیے ایک فیلڈ سٹڈی کی ضرورت ہے جو مدارس کے مہتمم حضرات، اساتذہ اور طلبہ سے انٹرویوز کی بنیاد پر کی جائے۔

ابتدائیہ

زیرِ نظر مطالعہ، اُس نصابِ تعلیم کا ایک جائزہ ہے جو 'درسِ نظامی' کے نام سے منسوب ہے اور اِس وقت مسلکِ دیوبند کے تعلیمی بورڈ، 'وفاق المدارس العربیہ' کے زیرِ اہتمام فعال مدارس میں پڑھایا جا رہا ہے۔ یوں اس مطالعے کو زمانی و مکانی اعتبار سے محدود کر دیا گیا ہے۔ اس کی افادیت جاننے کے لیے، بطور مقدمہ، چند باتیں پیشِ نظر رہنی چاہیں:

1۔ مدارس برصغیر کی مسلم تہذیبی روایت کا مستقل حصہ ہیں۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ ان کا کردار تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ماضی میں مدارس کے اس کردار کو اہلِ علم و تحقیق نے اپنے مطالعے کا موضوع بنایا۔ یہ مطالعہ کئی عنوانات کے تحت ہوا ہے۔ زیادہ تر اسے نوآبادیاتی دور تک محدود رکھا گیا، جب ہندوستان میں مسلم احیاء کے لیے سماجی، سیاسی اور عسکری تحریکیں شروع ہوئیں۔ اہلِ علم نے زیادہ تر ان تحریکوں کے ساتھ مدارس کے تعلق اور ان سے وابستہ ایسی شخصیات کو موضوع بنایا ہے جو ان تحریکوں میں سرگرم رہیں۔ اس مطالعے کی تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ تاہم مدارس کے موجودہ کردار کی تفہیم میں اس کی اہمیت جزوی ہے[1]۔

2۔ تقسیم ہند کے بعد، پاکستان میں مدارس کے کردار کو تاریخی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک 1947 سے لے کر 1979 تک، دوسرا 1979 سے تادمِ تحریر۔ پہلے دور کا موازنہ، ہم دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی عہد سے کر سکتے ہیں، جو 1866 میں قائم ہوا۔ اس دور میں مدارس نے خود کو علومِ اسلامیہ کی اس روایت کے تحفظ تک محدود رکھا جو اسلام کے صدرِ اوّل سے، ایک تواتر کے ساتھ وابستہ سمجھی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے انہیں عام طور پر نقلی علوم کہا جاتا ہے۔ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک کے بانی مولانا عبدالحق (م 1998) نے 1975 کے ایک انٹرویو میں، اس عہد میں مدارس کے کردار کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''موجودہ دینی مدارس کا نصب العین بھی صرف یہی ہے کہ دینی تعلیمات کا تحفظ کیا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: Metcalf, Barbara Dely, *Islamic Revival in British India: Deoband 1860-1900*, Karachi, Royal Book Company, 1982

جائے۔اس سے زیادہ ان مدارس کی بساط نہیں ہے کہ جو دین بزرگوں سے ہم تک پہنچا ہے وہی محفوظ رہے۔اس سے آگے بڑھ کر کچھ کرنے کے لیے ہمارے پاس وسائل ہیں اور نہ فنڈز[2]''۔

1947 سے 1979 تک دینی مدارس کا کردار، اہل علم کی توجہ کا زیادہ مستحق نہیں ٹھہرا۔اسے ایک معمول کے سماجی عمل کے طور پر دیکھا گیا یا جب علماء عملی سیاست میں متحرک ہوئے تو ان کے اس کردار کو سمجھنے کے لیے مدارس موضوع بنے لیکن ظاہر ہے کہ سرسری طور پر۔

3۔ 1979 کے بعد البتہ مدارس پر خصوصی توجہ دی گئی۔افغان جنگ میں مدارس کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ اور پھر 11/9 کے بعد کی فضا میں جو دینی بیانیہ مرتب ہوا، اُس کی تشکیل میں، مدارس کے کردار کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا۔ اس دور میں اگرچہ اس حوالے سے بہت کتابیں لکھی گئیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں جن باتوں کو بطور حقائق بیان کیا گیا، وہ قابل تصدیق (verifiable) نہیں تھیں۔ایسے ایسے مبالغہ آمیز دعوے سامنے آئے کہ پاکستانی معاشرے کے کسی واقف حال کے لیے یقین کرنا مشکل ہو گیا۔مثال کے طور پر جولائی ۲۰۰۲ میں ''انٹرنیشنل کرائسس گروپ'' کی ایک رپورٹ سامنے آئی جس میں یہ بتایا گیا کہ پاکستان میں ہر تیسرا بچہ مدرسے میں داخل کیا جاتا ہے[3]۔ ۱۹۹۸ کی مردم شماری کے مطابق، حقیقت یہ ہے کہ مدرسے میں داخلہ لینے والے طالب علموں کی تعداد، کل تعداد کا محض 0.3 فیصد ہے۔ اسی طرح 11/9 کمیشن رپورٹ میں ایک پولیس کمانڈر کے حوالے سے دعویٰ کیا گیا کہ کراچی میں ۸۵۹ مدارس ہیں۔اس کا کوئی حوالہ موجود نہیں۔پیٹر سنگر نے بروکنگس انسٹی ٹیوٹ کے لیے لکھی جانے والی ایک رپورٹ میں یہ بتایا کہ پاکستان میں ۵۴۰۰۰ مدارس ہیں۔اس کا بھی کوئی حوالہ موجود نہیں[4]۔ طاہر اندرابی اور دیگر محققین نے اپنے ایک مشترکہ

---

[2] احمد، ممتاز، دینی مدارس: روایت اور تجدید، اسلام آباد، ایمل مطبوعات، ۲۰۱۲، ص ۸۰

[3] http://www.crisisgroup.org/~/media/Files/asia/south-asia/pakistan/pakistan%20Madrasas%20Extremism%20And%20The%20The%20Military.pdf

رپورٹ کے مرتبین کو بعد میں اس کا اندازہ ہوا اور ۲۰۰۵ میں اس غلطی کا اعتراف کر لیا گیا۔

[4] Singer,Peter W.2001."Pakistan's Madrassahs: Ensuring a System of Education not Jihad. " Brookings Institutions Analysis Papers 41. Washingtion DC.

تحقیقی مقالے میں ایسی بہت سی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے[5]۔ آج تک ان مطالعات کے اعداد وشمار بطور حوالہ استعمال ہوتے ہیں اور ان کی بنیاد پر پالیسیاں تشکیل دی جاتی ہیں۔

4۔ اس میں شبہ نہیں کہ 1979 کے بعد پاکستان میں مدارس کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ 2012 میں اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور کے سکالرز کی ایک اجتماعی تحقیق سامنے آئی۔ اس کے مطابق جب پاکستان بنا، یہاں مدارس کی تعداد 245 تھی۔ 2011 تک یہ تعداد 50,000 تک پہنچ چکی تھی۔ اس نوعیت کی ریسرچ میں، مدارس کی تعداد میں اس اضافے کے سیاسی، سماجی اور معاشی اسباب کو تو تحقیق کا موضوع بنایا گیا لیکن مدارس کا نصاب اور ماحول کو زیادہ توجہ کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

5۔ پاکستان میں اگر مسلکی تقسیم کو دیکھا جائے تو زیادہ تعداد اہل سنت والجماعت بریلوی مکتب فکر کی ہے۔ تاہم مدارس کی غیر معمولی تعداد کا تعلق مسلک دیوبند سے ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دیوبندی، کل آبادی کا بیس فی صد ہیں جبکہ 65 فی صد مدارس اس مسلک سے متعلق ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ پاکستان میں مسلکی تشدد اور جہادی وعسکری جدوجہد کے جو مظاہر سامنے آئے، انکے ذمہ داران میں سے اکثر کا تعلق دیوبندی مسلک سے تھا۔ سپاہِ صحابہ جو اہلِ تشیع کی تکفیر کی علمبردار ہے، اس کے بانی مولانا حق نواز جھنگوی دیوبندی اور جمعیت علمائے اسلام کے عہدے دار تھے۔ اسی تنظیم سے لشکرِ جھنگوی نے جنم لیا۔ اس اندازِ نظر کے فروغ کے اسباب مدارس کا نصاب، ماحول یا اس کے اسباب خارج میں ہیں؟ یہ سوال بھی ہمارے ہاں کسی سنجیدہ مطالعے کا موضوع نہیں بنا۔

6۔ وفاق المدارس کے اپنے اعداد وشمار کے مطابق، پاکستان میں دیوبندی مدارس وجامعات کی تعداد 20560 ہے۔ یہاں زیرِ تعلیم طلبا وطالبات کی تعداد 25 لاکھ 10 ہزار 482 ہے۔ جو اساتذہ ان مدارس میں تدریسی ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں، ان کی تعداد 1 لاکھ 21 ہزار 879 ہے۔ تاہم ہم جانتے ہیں کہ غیر رجسٹرڈ مدارس کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ان مدارس کا تعلیمی ماحول اور نصاب کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کو سمجھے اور جانے بغیر، مدارس کے سماجی کردار کی نہ تو تفہیم ممکن ہے اور نہ تشکیل نو۔

---

[5] http://www.hks.harvard.edu/FS/akhwaja/papers/madrassa_CER_dec05.pdf

جو خواتین عالمات وفاق المدارس کے نظام سے فارغ ہوچکیں ان کی تعداد 1لاکھ 72 ہزار 950 ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تعداد مرد علماء سے زیادہ ہے۔یہ امر ایک الگ تحقیق کا متقاضی ہے کہ خواتین عالمات نے کس طرح سماج پر اپنے اثرات مرتب کیے۔یہاں یہ حوالہ اہم ہوگا کہ اسلام آباد میں جامعہ حفصہ نے لال مسجد کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔اسی طرح قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بطور ماں، وہ ایک خاندان کے فکری رجحانات پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ابھی تک اس نوعیت کا کوئی تحقیقی مطالعہ سامنے نہیں آیا جو عالمات کے سماجی کردار کو متعین کرتا ہو۔'الہدیٰ' جیسے اداروں کو تو موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے مگر دینی مدارس کی فارغ التحصیل عالمات کو نہیں۔

ان عوامل اور نتیجہ خیزی کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے زیرِ نظر مطالعے کی زمانی و مکانی اعتبار سے تحدید کر دی گئی ہے۔یوں یہ مطالعہ عمومی نہیں ہے۔عمومی مطالعہ سے معلومات تو جمع ہو جاتی ہیں لیکن اس سے کوئی قابلِ عمل حکمتِ عملی اخذ کرنا مشکل ہوتا ہے۔اس لیے نتائج کے اعتبار سے ایسا مطالعہ زیادہ مفید ہوتا ہے جو ایک محدود دائرے میں ہو۔انہی خطوط پر اگر اس جائزہ کو دوسرے اداروں تک پھیلا دیا جائے تو اُس کی افادیت بھی مسلمہ ہے۔اس مطالعے کے چند خواص واضح ہیں:

1۔ یہ درس نظامی کے صرف اس نصاب کا مطالعہ ہے جو اِس وقت وفاق المدارس کے زیرِ اہتمام مدارس میں پڑھایا جا رہا ہے۔اس تحدید سے یہ جاننا ممکن ہے کہ وفاق کا نصاب، درسِ نظامی کے روایتی نصاب سے کتنا مختلف اور کتنا اُس کے مطابق ہے۔مزید یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کیا تبدیلیاں آئی ہیں۔

2۔ اس مطالعے میں اس بات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے کہ ان مدارس میں کیا کیا مضامین پڑھائے جا رہے ہیں اور مجموعی نصاب کے حوالے سے ان کا تناسب کیا ہے۔

3۔ اس میں یہ تجزیہ بھی کیا گیا ہے کہ اسلامی علوم (Islamic Sciences) اور معاون علوم کی تدریس میں ہمارے خیال میں کیا کیا کمزوریاں ہیں۔یہ علوم کن ارتقائی مراحل سے گزرے اور آج مدارس کے نصاب میں کیسے ان سے صرفِ نظر کیا گیا۔

4۔ اس مطالعے کی روشنی میں جو امور سامنے آئے ہیں، ان کی روشنی میں سفارشات بھی مرتب کی گئی ہیں۔یہ بھی

دیکھا گیا ہے کہ مدارس جن مقاصد کے لیے قائم ہوئے، ان کے حصول کے لیے اس نصاب میں کیا تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

اس مطالعے کے لیے بنیادی مواد کی فراہمی اور تحقیق کی ذمہ داری مفتی محمد زاہد صاحب اور حافظ عمار خان صاحب ناصر نے اٹھائی۔ ان کی حیثیت 'محرمِ راز درونِ مے خانہ' کی ہے۔ وہ چند ایسے لوگوں میں سے ہیں جو مدرسے کی روایت سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ، دورِ جدید کی علمی وفکری ضروریات سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود، جس طرح یہ ذمہ داری نبھائی، اس کے لیے میں ان دونوں حضرات کا بے حد ممنون ہوں۔ ڈاکٹر محمد خالد مسعود صاحب نے ہمیشہ کی طرح سرپرستی کی۔ عالمِ اسلام میں ڈاکٹر صاحب کا علمی وفکری مقام مسلم ہے۔ انہوں نے نہ صرف اس کا مسودہ بار بار دیکھا، بلکہ اس میں بہتری کے لیے مسلسل راہنمائی کی۔ اس کی سفارشات کو بامعنی بنانے میں بھی پوری معاونت کی۔ ان کا علم وفضل ماضی کی طرح مشعلِ راہ رہا۔ ان کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے۔

اس کے باوصف، یہ مطالعہ حرفِ آخر نہیں۔ یہ بات البتہ اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ پہلا معروضی مطالعہ ہے جو وفاق المدارس کے قیام کے مقاصد اور نصاب کے جائزے پر مبنی ہے۔ مدارس کے ماحول کو نصاب سے الگ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ تحقیق کا ایک مستقل موضوع ہے، جو زیرِ نظر مطالعے کی حدود سے باہر ہے۔ امید ہے کہ مدارس کے نظام کو سمجھنے کے لیے یہ مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

خورشید احمد ندیم

بابِ اوّل

درسِ نظامی

(وفاق المدارس العربیہ کا نصابِ تعلیم)

پس منظر، تاریخ، نصاب

پاکستان میں وفاق المدارس کے نصاب سے متعلق مسائل کو سمجھنے سے پہلے، اس وفاق سے منسلک مدارس اور ان کے نظام ونصاب کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس حوالے سے یہاں مرحلہ وار چند مختصر تعارفی نکات پیش کیے جارہے ہیں۔

۱۸۵۷ء سے پہلے

- نصاب کے اجزائے ترکیبی:

۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں مغل بادشاہت کے باقاعدہ خاتمے اور ہندوستان کے براہِ راست تاجِ برطانیہ کے ماتحت ہونے سے پہلے صدیوں سے مسلمانوں کی ایک تعلیمی روایت چلی آرہی تھی، اس نظامِ تعلیم کے بنیادی اجزائے ترکیبی یہ تھے:

1۔ وہ علوم جن کا تعلق عربی زبان سمجھنے کے ساتھ ہے جیسے عربی ادب، صرف ونحو (گرامر) بلاغت وغیرہ۔ اس میں زیادہ اہمیت عموماً عربی گرامر اور اس کے فلسفے کو حاصل رہی۔

2۔ وہ علوم جن کا تعلق براہِ اسلام کو سمجھنے سے ہے، جیسے، قرآن اور اس کی تفسیر، حدیث، فقہ۔ ان علوم کو عموماً دینیات کے نام سے جانا جاتا تھا۔

3۔ وہ علوم جو صرف اسلامی اور عربی علوم کی تفہیم ہی میں کارآمد نہیں بلکہ اس زمانے کے ایک پڑھے لکھے انسان کی

ضرورت تھے۔ جیسے ریاضی، طب، منطق، فلسفہ، فارسی زبان وادب وغیرہ۔ یہ علوم وہ ہیں جو عموماً اس زمانے میں صرف عالمِ دین ہی نہیں ہر دانشور کی ضرورت سمجھے جاتے تھے۔ سرکاری مناصب کے حصول میں بھی ان علوم پر دسترس کا خاصا عمل دخل ہوتا تھا۔ اس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ محض دین فہمی نہیں بلکہ سول سروس کا بھی نصاب تھا۔ آخری قسم کے مضامین کے بڑے حصے کو ''معقولات'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

- قبلِ از ۱۸۵۷ء کے دور کے نصابِ تعلیم میں برصغیر کے مختلف علاقوں اور درس گاہوں میں تنوع بھی پایا جاتا تھا، تاہم زیادہ تر صورتِ حال یہ تھی کہ ان نصاب ہائے تعلیم میں دینیات کا حصہ سب سے کم، عربی زبان وگرامر سے متعلقہ علوم کا حصہ اس سے زیادہ اور معقولات کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ اس کا اندازہ درسِ نظامی کے حوالے سے آگے پیش کئے جانے والے ایک جائزے سے ہوتا ہے۔

برصغیر میں علمِ فقہ پر زیادہ کام کی وجہ سے عام تاثر یہ ہے کہ یہاں علم حدیث کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ اس موضوع پر مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی تحریروں سے علم حدیث کی تدریس کے بارے میں دو مختلف نقطہ ہائے نظر کا پتہ چلتا ہے۔ حالیہ تحقیقی مقالات نے اس بات پر مزید روشنی ڈالی ہے کہ دینی تعلیم میں علم حدیث پر زور دینے میں دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے مولانا حیات سندھی اور ان کے اساتذہ اور تلامذہ کا کردار بے حد اہم رہا ہے۔ ان حضرات نے حجاز مقدس میں علم الحدیث کی تدریس کا احیا کیا۔ برصغیر کے جن علماء کا اس تدریسی تحریک سے رابطہ ہوا، ان میں دو درسی حلقے اس حوالے سے بڑے استثنا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے برصغیر میں علمِ حدیث کی تدریس کو رواج دینے کی خاص کوشش کی۔ ان میں سے ایک حلقہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۵۵۱ء – ۱۶۴۲ء، ۹۵۸ھ – ۱۰۵۲ھ) سے منسوب ہے۔ انہوں نے تقریباً چار سال حجاز مقدس میں رہ کر علمِ حدیث حاصل کیا اور برصغیر میں اس علم کی اشاعت کے لئے محنت کی۔ دوسرا حلقہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳ء – ۱۷۶۲ء) کا ہے۔ انہوں نے بھی حجاز سے علمِ حدیث حاصل کیا اور برصغیر میں اس کی تعلیم واشاعت کا اہتمام کیا۔ اپنے اثرات کے حوالے سے شاہ ولی اللہؒ کی کاوشیں زیادہ پائیدار ثابت ہوئیں۔ مثلاً شاہ صاحب سے پہلے کے نصاب میں حدیث عموماً صرف ''مشکوۃ المصابیح'' پڑھائی جاتی تھی، شاہ صاحب نے حدیث کی چھ معروف کتابوں کی تدریس کو بھی رواج دیا جنہیں ''صحاح ستہ''

کہا جاتا ہے، اس وقت برصغیر میں جہاں جہاں حدیث کی ان چھ کتابوں کی تدریس ہورہی ہے، اکثر و بیشتر ان کا سلسلہ اسناد شاہ ولی اللہؒ کے ذریعے ہی آگے جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے فرزند شاہ عبدالعزیز نے علوم حدیث کی تدریس کے لئے نصابی کتابیں بھی لکھیں جن میں ''عجالہ نافعہ'' اور ''بستان المحدثین'' بہت مقبول ہوئیں۔

درس نظامی:

قبل از ۱۸۵۷ء کے اسی دور میں، ایک نمایاں پیش رفت درس نظامی کی تدوین کی شکل میں ہوئی۔ یہ نصاب ملا نظام الدین سہالوی (م ۱۷۴۸ء) کی طرف منسوب ہے جو لکھنؤ کے معروف تعلیمی سلسلے فرنگی محل کے بانی مبانی شمار ہوتے ہیں۔ فرنگی محل کے اس تعلیمی سلسلے نے بہت سی کتابیں یادگار چھوڑیں اور متعدد نمایاں علمی شخصیات پیدا کیں، جن میں بطور مثال مشہور مصنف اور محقق مولانا عبدالحی لکھنوی کا نام ذکر کیا جاسکتا ہے اور کتابوں میں ملا محبّ اللہ بہاری (م ۱۷۰۷ء) کی اصولِ فقہ پر مشہور کتاب ''مسلم الثبوت'' کی شرح ''فواتح الرحموت'' قابلِ ذکر ہیں، جس کے مصنف ملا عبدالعلی درسِ نظامی کے بانی ملا نظام الدین کے صاحبزادے ہیں اور اپنی علمی مہارت اور تنوع کی وجہ سے بحرالعلوم (علم کا سمندر) کے لقب سے جانے جاتے ہیں۔

اس پس منظر کے بعد، اس نصاب کے مشمولات کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے۔ ہمارا اصل موضوع، وفاق المدارس کا نصاب، چونکہ درسِ نظامی پر ہی مبنی ہے، اس لئے ایک نظر اسے دیکھ لینا ضروری ہے۔ لہذا یہاں درسِ نظامی میں شامل کتب کی فہرست پیش کی جارہی ہے۔

درسِ نظامی کے مشمولات:

۱۔ دینیات

۱۔ تفسیر:

- تفسیرِ جلالین: جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء)
- جلال الدین محلی (م ۸۶۴ھ ۱۴۵۹ء)
- تفسیر بیضاوی: ناصر الدین بیضاوی (م ۶۸۵ھ ۱۲۸۶ء)

۲۔ حدیث:

- مشکوۃ المصابیح (مکمل): ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ (م ۸۶۰ھ)

۳۔ فقہ:

- ہدایہ: علامہ برہان الدین مرغینانی (م ۵۹۳ھ 1197ء)
- شرح وقایہ: عبیداللہ بن مسعود صدر الشریعہ (م ۷۴۷ھ 1346ء)

۴۔ اصول فقہ:

- توضیح وتلویح: سعد الدین تفتازانی (م ۷۹۲ھ 1389ء)
- نور الانوار: شیخ احمد بن ابی سعید ملا جیون (م ۱۱۳۰ھ 1718ء)
- مسلم الثبوت: قاضی محبّ اللہ بہاری (م ۱۱۱۹ھ 1707ء)

۲۔ عربی زبان وقواعد

۵۔ نحو:

- نحو میر: سید شریف جرجانی (م ۸۱۶ھ 1413ء)
- شرح مائۃ عامل: حسین بن عبداللہ نوقانی (م ۹۲۶ھ 1520ء)
- ہدای النحو: ابوحیان، محمد بن یوسف بن علی (م ۷۴۵ھ 1344ء)
- کافیہ: ابن حاجب (م ۶۴۶ھ 1249ء)
- شرح جامی: نور الدین عبدالرحمٰن جامی (م ۸۹۸ھ 1492ء)۔

۶۔ صرف:

- میزان: ملا حمزہ بدایونی
- منشعب: ملا حمید الدین کاکوری (م ۱۲۱۵ھ 1801ء)
- صرف میر: سید شریف جرجانی (م ۸۱۶ھ 1413ء)

- پنج گنج: سراج الدین اودھیم (۷۵۸ھ)
- زبدہ: ظہیر بن محمود بن مسعود علوی
- فصول اکبری: قاضی علی اکبر حسینی آلہ آبادی (م۱۰۹۰ھ1678ء)
- شافیہ: ابن حاجب (۶۴۶ھ1249ء)

۷۔ **بلاغت:**

- مختصر المعانی: سعد الدین تفتازانی (۷۹۲ھ1389ء)
- مطول: سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی (م۷۹۲ھ1389ء)

۳۔معقولات

۸۔ **کلام:**

- شرح عقائد نسفی: سعد الدین تفتازانی
- شرح عقائد جلالی: جلال الدین دوانی (م۹۰۸ھ1502ء)
- شرح مواقف: سید شریف جرجانی (م۸۱۶ھ1413ء)
- رسالہ میر زاہد: میر محمد زاہد ہروی (م۱۱۰۱ھ1690ء)

۹۔ **منطق:**

- قطبی: قطب الدین رازی
- سلم العلوم: قاضی محبّ اللہ بہاری
- میر قطبی: میر سید شریف جرجانی
- صغریٰ: میر سید شریف جرجانی (م۸۱۶ھ1413ء)
- کبریٰ: میر سید شریف جرجانی (م۸۱۶ھ1413ء)
- ایساغوجی: اثیر الدین ابہری (۸۷۵ھ1344ء)

- تہذیب: سعدالدین تفتازانی (م۷۹۲ھ1389ء)
- شرح تہذیب: عبداللہ یزدی (۹۸۱ھ1575ء)۔

۱۰۔ فلسفہ/حکمت:

- شرح ہداہۃ الحکمۃ (میبذی): میر حسین میبذی (م۱۰۹۶ھ1685ء)
- صدرا: صدرالدین محمد بن ابراہیم (م۱۰۵۱ھ1640ء)
- شمس بازغہ: ملا محمود بن شیخ محمد بن شاہ محمد فاروق جون پوری (م۱۰۶۲ھ1652ء)

۱۱۔ ریاضی:

- خلاصہ الحساب: بہاءالدین عاملی (م۱۰۳۱ھ1622ء)
- تحریر اقلیدس: خواجہ نصیرالدین طوسی (م۶۷۲ھ1275ء)
- تشریح الافلاک: بہاءالدین عاملی (م۱۰۳۱ھ1622ء)
- رسالہ قوش نجیہ: علاءالدین قوشجی (م۸۷۹ھ1474ء)
- شرح چغمینی: علامہ موسیٰ پاشا رومی (م۷۲۳ھ1437ء)

بنیادی خصوصیات:

- اس نصاب میں غالباً اس وقت کے برصغیر کے رائج تعلیمی رجحانات کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں دقیق اور مشکل تعبیرات پر مشتمل کتابوں کو حل کرنا اور سمجھنا سب سے بڑا کام سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اس نصاب میں بھی زیادہ تر اسی نوعیت کی کتابوں کو شامل کیا گیا ہے۔
- موضوعات کی تقسیم میں بھی اس دور کا وہ رجحان جھلکتا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا کہ سب سے زیادہ اہمیت معقولات، اس کے بعد عربی گرامر وغیرہ کو اور سب سے کم براہِ راست دینی علوم (جنہیں علومِ عالیہ بھی کہا جاتا ہے) کو اہمیت حاصل تھی، اس امر کا اندازہ کتابوں کی تقسیم کے درج ذیل جدول سے لگایا جاسکتا ہے۔

نمبر شمار	علوم / مضامین	تعداد مقررہ کتب	نصاب میں فیصدی تناسب
1	علوم عالیہ (تفسیر، حدیث، فقہ، اُصول فقہ)	9	21%
2	علوم عقلیہ (منطق، حکمت، ریاضی، کلام)	20	47%
3	علوم لسانیات / آلیہ (صرف، نحو، بلاغت)	14	32%

- حدیث کی صرف ایک کتاب مشکوۃ المصابیح اس نصاب میں شامل ہے۔
- اس نصاب کی ایک خاص بات یہ قابلِ توجہ ہے کہ اس میں عربی گرامر اور بلاغت کی کتابیں تو شامل ہیں عربی ادب کی کوئی کتاب نصاب میں شامل نہیں۔
- اس نصاب کی مقبولیت میں جہاں اس نصاب کے مرتب کی علمی شہرت ہوسکتی ہے وہیں ایک ممکنہ وجہ، مغل بادشاہ عالمگیر (۱۹۷۸ء–۱۷۰۷ء) جو مسلمانوں کے دینی حلقوں میں کافی مقبول رہے ہیں، کے ساتھ ملا نظام الدین کی قربت بھی ہوسکتی ہے۔ ملا نظام الدین کے والد ملا قطب الدین ۱۶۹۶ء میں ایک مقامی تنازعے میں قتل ہوگئے تھے، اس وقت ملا نظام الدین کی عمر کوئی چودہ، پندرہ سال ہوگی۔ یہ اپنے بھائی کے ساتھ عالمگیر کے دربار میں پہنچے، بادشاہ نے لکھنؤ کی مشہور بلڈنگ ''فرنگی محل'' ان کے نام الاٹ کردی[6]۔ تحصیل علم کے بعد اسی جگہ کو انہوں نے درس وتدریس کا مرکز بنایا۔ ملا نظام الدین کے بڑے بھائی مولانا محمد سعید سہالوی فتاوی عالمگیری کے مرتبین میں شامل ہیں۔ فتاوی عالمگیری فقہ حنفی کی معروف کتاب ہے جسے عالمگیر کی مقرر کردہ علماء کی ایک ٹیم نے بادشاہ کی سربراہی میں مرتب کیا تھا۔

مابعد ۱۸۵۷ء

دارالعلوم دیوبند اور اس جیسے اداروں کا قیام:

۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد تعلیمی ماحول میں ایک نمایاں تبدیلی آئی۔ یہ دینی تعلیمی کے لئے ایسینجی (پرائیویٹ) اداروں کا قیام تھا جو طلبہ کو تو تعلیم اور رہائش کی سہولیات مفت فراہم کریں اور اخراجات عام لوگوں کے عطیات سے پورے کریں۔ اس طرح کے اداروں میں دو ادارے ایسے ہیں جن کے پاکستان کے دینی مدارس کے

[6] عبدالحی حسنی لکھنوی: نزہۃ الخواطر ۶/۷۸۶

کے عطیات سے پورے کریں۔اس طرح کے اداروں میں دو ادارے ایسے ہیں جن کے پاکستان کے دینی مدارس کے سب سے بڑے نیٹ ورک ''وفاق المدارس العربیہ'' پر سب سے زیادہ اثرات ہیں: ایک دارالعلوم دیوبند اور دوسرا مظاہر علوم سہارن پور۔اس وفاق سے منسلک مدارس کو دارالعلوم دیوبند ہی کی فکر کا تسلسل سمجھا جاتا ہے۔وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے دستور کی دفعہ ۱۸ میں اس بات کی تصریح ہے کہ وفاق سے ملحق کسی مدرسے یا جامعہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اہل السنّت والجماعت حنفی (دیوبندی) مسلک پر ہو۔

دارالعلوم دیوبند کے مقاصدِ قیام اور اس کے اندازِ تربیت پر بات کرتے ہوئے، مولانا قاری محمد طیب، جو بانی دارالعلوم کے پوتے ہونے کے ساتھ، سب سے طویل عرصہ تک اس ادارے کے مہتمم رہے، لکھتے ہیں:

> ''1857ء کے بعد کے دور میں جب کہ مسلمانوں کی شوکت ہندوستان سے پامال ہوچکی تھی اور حالات میں یکسر انقلاب اور تبدیلی آچکی تھی، دارالعلوم نے ان بدلے ہوئے حالات میں جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ کہ مسلمانوں میں بلحاظِ دین ومذہب اور بلحاظِ معاشرت تبدیلی نہیں ہونے کی دی کہ وہ حالات کی رو میں بہہ جائیں۔ پختگی اور عزیمت کے ساتھ انہیں اسلامی سادگی اور دینی ثقافت کے زاہدانہ ومتوکلانہ اخلاق پر قائم رکھا، مگر اس حکمت کے ساتھ کہ عوام کی حد تک اندرونِ حدود جائز توسعات سے گریز نہیں کیا جو بدلتے ہوئے تمدن ومعاشرت میں طبعی طور پر ناگزیر تھا، مگر خواص کی حد تک دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا، جس سے عام مسلمانوں میں اسلامی مدنیت کا سادہ سا نقشہ قائم رہا''۔

دارالعلوم دیوبند کی بنیادی خصوصیات:

دارالعلوم دیوبند کے نصابِ تعلیم اور اس کے عمومی نظام کے چند بنیادی امتیازات ہیں، جنہیں علمائے دیوبند نے بیان کیا ہے۔ان میں درجِ ذیل امور کو بطور خاص شمار کیا جاسکتا ہے۔

1۔ عوام پر انحصار اور ان سے مسلسل رابطہ:

سب سے پہلی چیز جس کو شروع ہی سے بطور خاص مدنظر رکھا گیا وہ عوام سے مسلسل رابطہ اور عوام پر انحصار

ہے۔ چنانچہ دارالعلوم کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنی ایک وصیت میں دارالعلوم کے چند بنیادی اصولوں کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کا (یعنی دارالعلوم کا) تعلق عام مسلمانوں سے زیادہ سے زیادہ ہو، تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کرے، جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصلی شکل میں قائم رکھنے میں معاون ہو''

مزید لکھتے ہیں:

''جمہوری تعلق ہو، جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے[7]''

2۔ جدید نظامِ تعلیم سے استفادہ:

مولانا مناظر احسن گیلانی (م ۱۹۵۶) نے ''سوانح قاسمی'' میں اسی بات کو بیان کیا ہے۔ ان کے بقول، دار العلوم دیوبند میں شروع ہی سے یہ اصول اپنایا گیا کہ اگرچہ یہاں تعلیم دینی علوم ہی کی ہو لیکن انداز جدید، منظّم نظامِ تعلیم کا ہو، جس سے اس سے قبل دینی تعلیم شناسا نہیں تھی۔ اس کی ایک ممکنہ وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے خود زیادہ تر تعلیم مولانا مملوک علی سے حاصل کی جو عربک کالج دلی کے سربراہ تھے، نیز دیوبند کی مجلس شوریٰ نمایاں شخصیات میں سے مولانا ذوالفقار علی (مولانا محمود حسن کے والد) اور مولانا فضل الرحمٰن (مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد) محکمہ تعلیم ہی میں سرکاری ملازمت سے پنشن یافتہ تھے۔ جبکہ اس دور میں عموماً نہ صرف یہ کہ دینی تعلیم میں اس طرح کے منظّم نظام کا تصور نہیں تھا بلکہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے پیش کردہ مواد کے مطابق مغربی ایجاد ہونے کی وجہ سے اسے ناپسندیدگی کی نظر سے بھی دیکھا جاتا تھا۔ مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''عہدِ حاضر کا تعلیمی نظام جس سے مغرب نے دنیا کو روشناس کیا ہے، اس میں جماعت بندی، امتحان خصوصاً تحریری امتحان، طلبہ کی حاضری کے رجسٹر اور ازیں قبیل دوسرے لوازم وخواص جن کے ایک بڑے حصہ کو دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نظام میں نہ صرف

---

[7] مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی ۲۲۱/۲ مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور۔

قبول ہی کرلیا گیا ہے بلکہ پوری قوت واحتیاط کے ساتھ تعلیم کی ان جدید خصوصیات کی نگرانی بھی کی جاتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی عصری یونیورسٹیوں میں جتنا لحاظ وپاس ان امور کا کیا جاتا ہے دارالعلوم میں بھی اس پر زیادہ نہیں تو کچھ کم توجہ نہیں کی جاتی[8]''

دارالعلوم کی ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۴ء) کی مطبوعہ روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ سے امتحانی مقالہ جات بھی لکھوائے جاتے تھے[9]۔

3۔ نصاب پر شاہ ولی اللہؒ کے طرزِ تعلیم کے اثرات:

دارالعلوم دیوبند کے سب طویل عرصے تک رہنے والے مہتمم مولانا قاری محمد طیب (م ۱۹۳۸) نے دارالعلوم کی سڑسٹھ سالہ تاریخ میں دعویٰ کیا ہے کہ دیوبند درحقیقت شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳) ہی کے مدرسہ فکر کا تسلسل ہے[10]۔ اسے شاہ ولی اللہؒ کا اثر قرار دیا جاتا ہے کہ اب تک مروج درسِ نظامی میں دینی علوم بالخصوص علم حدیث کا حصہ بہت کم تھا۔ دار العلوم کے نصاب میں اسے خاص اہمیت دی گئی، چنانچہ صحاحِ ستہ سمیت حدیث کی اہم کتابیں باقاعدہ شاملِ نصاب ہوئیں، عربی ادب کی کچھ کتابیں بھی شاملِ نصاب ہوئیں۔

4۔ نصاب کا بانیان کے مجوزہ ماڈل سے ہٹ کر درسِ نظامی کی روش پر لوٹ آنا:

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے بانیان کے ذہن میں نصابِ تعلیم کا جو اصل ماڈل تھا، وہ مروجہ درسِ نظامی سے خاصا مختلف تھا، جس کے بنیادی خدوخال یہ تھے:

- نصاب میں زیادہ توجہ دینی علوم کی طرف ہو، چنانچہ ابتدائی دور کے ایک کانووکیشن سے خطاب کرتے ہوئے مولانا قاسم نانوتوی نے کہا:

''صرف بجانب علوم نقلی (خالص اسلامی ودینی علوم) اور نیز ان علوم کی طرف جن سے

---

[8] سوانح قاسمی ۲/۲۱۸

[9] سوانح قاسمی ۲/۲۷۵

[10] قاری محمد طیب، مختصر تاریخ دارالعلوم دیوبند مندرجہ در ''مجموعہ رسائل حکیم الامت'' ۷/۲۶۸ مکتبۃ الأحرار مردان

استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے انعطاف ضروری سمجھا گیا[11]۔''

- عربی ادب سے متعلق کتابوں کا اضافہ
- قدیم منطق وفلسفہ کی کتابوں کی تعداد کافی کم کردی گئی[12]۔ دیوبند ہی کے دوسرے سرپرست اعلیٰ مولانا رشید احمد گنگوہی اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''لہذا اس فن خبیث (فلسفہ) کا مدرسہ سے اخراج کردیا گیا تھا، چنانچہ ایک سال سے اس کی پڑھائی مدرسہ دیوبند سے موقوف کردی گئی ہے۔ مگر بعض مدرسین اور طلبہ کا خیال اس طرف چلا جاتا ہے اور شاید خفیہ خفیہ درس بھی اس کا ہوتا ہو[13]''

- نصاب بھاری بھرکم کی بجائے مختصر ہو، چنانچہ ایک وقت ایسا بھی تھا جبکہ کل نصاب چھ سالہ تھا (اب درس نظامی آٹھ سالہ ہے) اور یومیہ ساعات (پیریڈز) کل تین ہوتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) کی مطبوعہ روداد میں کہا گیا ہے:

''کل میعاد تمام کتب اسباق ثلاثہ کے چھ سال معین ہوئے''

لیکن وقت گذرنے کے ساتھ یہ ہوا کہ اصل ماڈل کی رو سے جن کتب کا پرانے درسِ نظامی پر اضافہ ہوا تھا، ایک طرف تو وہ داخلِ نصاب ہوگئیں، مثلاً حدیث یا عربی ادب کی کتب، مگر دوسری طرف یہ ہوا کہ معقولات کی جن کتب کو خارج کیا گیا تھا، وہ اخراج برقرار نہ رہ سکا اور وہ کتابیں آہستہ آہستہ دوبارہ نصاب میں شامل ہوتی گئیں۔ وجہ اس کی یہ بیان کی گئی کہ درس نظامی میں شامل ان معقولی کتابوں کے بارے میں یہ تصور عام ہو چکا تھا کہ ان کے بغیر علمی استعداد نہیں بنتی، اس لئے ان کتب کا اخراج قدیم انداز کے حلقہ ہائے درس کی طرف سے تنقید کا نشانہ بنتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند چونکہ قدیم حلقوں سے اپنا رشتہ اور ان میں اپنا اعتبار برقرار رکھنا چاہتا تھا، اس لئے ندوۃ العلماء کے برعکس

---

[11] سوانح قاسمی ۲/۲۸۰

[12] سوانح قاسمی ۲/۲۸۶

[13] سوانح قاسمی ۲/۲۹۳

دیوبند اس طرح کی تنقیدوں کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

''عام طور پر درس نظامیہ کے مولویوں میں دیوبند سے فارغ ہونے والوں کے متعلق سطحی ہونے کا تعریضی فقرہ مشہور تھا، کہتے ہیں کہ نظامیہ نصاب کے پڑھانے والے ایک مشہور و معروف مولوی صاحب کا دستور تھا کہ ان سے پڑھنے والے طلبہ میں کوئی طالب علم کسی مسئلے پر الجھنے لگتا اور نافہمی سے کام لیتا تو مولوی صاحب کہتے ''دیکھو! اس کا چہرہ دیوبند کی طرف تو نہیں ہے'' ظاہر ہے کہ یہ حال زیادہ دن تک قابل برداشت نہیں رہ سکتا تھا، اسی کا نتیجہ ہے دارالعلوم کے نصاب میں درس نظامیہ کی ایک ایک معقولی کتاب اپنے تمام منہیات وحواشی کے ساتھ اسی طرح بتدریج شریک ہوتی چلی گئی جن کو خارج کر کے نصاب کو چھ سال محدود مدت میں ختم کرانے کا انتظام کیا گیا تھا''۔

چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ قاری محمد طیب صاحب نے مختصر تاریخ دارالعلوم دیوبند کے نام سے جب اس ادارے کی سرسٹھ سالہ تاریخ لکھی تو اس میں ذکر کردہ دارالعلوم کے نصاب میں تقریباً وہ تمام معقولی کتابیں شامل ہیں جو اصل درسِ نظامی کا حصہ تھیں۔

اس طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں دارالعلوم دیوبند کا نصاب عملاً درسِ نظامی ہی کا تسلسل تھا، جس میں کچھ عربی ادب کی کتب اور شاہ ولی اللہؒ کے طریقے کا تسلسل ہونے کی وجہ سے، حدیث کی کتابوں کا اضافہ کر لیا گیا تھا۔

بعد از قیامِ پاکستان

یہ تصور تو قیامِ پاکستان سے پہلے بھی موجود تھا کہ، دیوبندی فکر سے وابستہ مدارس کو ایک مربوط نظام میں منسلک ہو کر، اپنی تعلیم میں یکسانیت پیدا کرنی چاہئے۔ خود دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داران میں اس ضرورت کا احساس موجود تھا کہ دوسری جگہوں پر اسی انداز کے مدارس قائم ہوں۔ چنانچہ مولانا نانوتوی و دیگر بانیان دارالعلوم کے حالاتِ زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دیگر مقامات پر بھی اسی انداز کے مدارس قائم کروانے کی کوشش کی۔ ۱۲۹۲ھ کے کانووکیشن میں خطاب کرتے ہوئے مولانا قاسم نانوتوی نے سہارن پور کے مدرسہ مظاہر علوم کے قیام پر بھی خوشی کا اظہار کیا، اور یہ

کہا کہ ''آج وہ مدرسہ اس مدرسہ کا ہم جہت ہے''۔مولانا مناظر احسن لکھتے ہیں:

''بہر حال قصبہ دیوبند کے سوا قرب وجوار کی چھوٹی بڑی آبادیوں میں مدرسے جو قائم ہورہے تھے، آج تو عموماً یہ مدرسے جداگانہ ہستی اور مستقل وحدت کی حیثیت میں نظر آتے ہیں، لیکن قدیم رودادوں کے جائزے سے اس کا انکشاف ہوتا ہے کہ کافی مدرسے ان میں ایسے بھی تھے جو باضابطہ دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت کو تسلیم کرکے اس کے ساتھ اس طرح سے ملحق تھے جیسے جدید عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کے ساتھ مختلف شہروں میں قائم ہونے والے کلیات اور کالج ملحق ہوا کرتے ہیں۔ان الحاقی تعلیم گاہوں کی تعلیم ونصاب، مدرسین کا تقرر، ان کے امتحانات، ان کی آمدوخرچ کا حساب وکتاب، یہ اور اس قسم کے سارے متعلقہ امور پر براہِ راست دارالعلوم کی نگرانی قائم تھی''

لیکن جیسا کہ اس اقتباس سے معلوم ہورہا ہے کہ جو مدارس دارالعلوم دیوبند کے ساتھ امتحانی اور انتظامی طور ملحق تھے وہ آہستہ آہستہ مستقل اکائی کی حیثیت حاصل کرتے رہے۔

وفاق المدارس کا قیام

قیامِ پاکستان کے بعد دیوبندی فکر سے وابستہ مدارس کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے اور ان کے نصاب و امتحانات میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے ''وفاق المدارس العربیہ'' پاکستان کے نام سے ایک تنظیم وجود میں لائی گئی، جس کا سب سے پہلا اجلاس جامعہ خیر المدارس ملتان میں 20 شعبان المعظم 1376ھ مطابق 22 مارچ 1957ء کو مولانا خیر محمد جالندھری مہتمم خیر المدارس ملتان کی صدارت میں منعقد ہوا۔اس اجلاس کے داعی بھی وہی تھے۔اس پہلے اجلاس میں ایک تنظیمی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ تنظیمی کمیٹی کے اجلاس منعقدہ 15-14 ربیع الثانی 1379ھ مطابق 19-18 اکتوبر 1959 میں باقاعدہ طور پر ''وفاق المدارس العربیہ پاکستان'' کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی گئی، جس میں وفاق کے دستور کی منظوری کے ساتھ ساتھ تین سال کے لئے عہدیداران کا انتخاب عمل میں آیا۔صدر وفاق مولانا شمس الحق افغانی، نائب صدر اول مولانا خیر محمد جالندھری، نائب صدر دوم مولانا محمد یوسف بنوری، ناظم اعلیٰ مولانا

مفتی محمود اور خازن مولانا مفتی عبداللہ (استاد خیر المدارس ملتان) مقرر ہوئے۔

اغراض ومقاصد:

خود وفاق المدارس کے دستور میں جو اغراض ومقاصد ذکر کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) ملحقہ جامعات مدارس عربیہ کے جملہ درجات بشمول تکمیل وتخصص وتدریب المعلمین والمعلمات کیلئے جامع نصاب تعلیم مرتب کرنا اور امتحانات میں کامیاب طلب ہو طالبات کو شہادات (اسناد) جاری کرنا۔

(۲) مدارس عربیہ جامعات میں باہمی اتحاد اور ربط پیدا کرنے کی کوشش اور ان کو منظّم کرنا۔

(۳) مروجہ نصاب تعلیم میں جدید دینی تقاضوں کے مطابق مناسب وموزوں تصرف کرنا اور حسب ضرورت کتب طبع کرانا۔

(۴) وہ مدارس وجامعات جو اس وفاق سے الحاق کریں ان میں نصاب تعلیم، نظام تعلیم اور امتحانات میں باقاعدگی، یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنا۔

(۵) جدید عصری تقاضوں کے مطابق تعلیمات اسلامیہ کی ترویج اور نشر واشاعت اور اہم موضوعات پر مستند اور تحقیقی کتابیں تالیف وتصنیف کرانا۔

(۶) مدارس دینیہ وجامعات کے تحفظ وترقی اور معیار تعلیم کو بلند کرنے کے لئے صحیح اور موثر ذرائع اختیار کرنا۔

(۷) تربیت المعلمین والمعلمات کا موثر ومناسب انتظام کرنا۔

عوامل ومحرکات:

ایک مربوط نظامِ تعلیم کا سابقہ تصور:

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا یہ تصور قیامِ پاکستان سے پہلے بھی دار العلوم دیوبند جیسے اداروں میں موجود تھا کہ متعدد ادارے ایک نظام میں مربوط ہوں، اس مقصد کے لئے دیوبند میں دیگر اداروں کا الحاق (affiliation) قبول کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ پاکستان میں اس تجربے کی سب سے پہلی صدائے بازگشت ہمیں مولانا خیر محمد جالندھری بانی جامعہ خیر المدارس ملتان کے ہاں ملتی ہے۔ جامعہ کی مجلس شوریٰ جو سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۶۰ء کے تحت حکومت

مغربی پاکستان کے ساتھ ۱۹۵۵ء میں رجسٹرڈ ہوئی، کے منظور کردہ دستور کی دفعہ ۳ میں اغراض ومقاصد کے ضمن میں ایک نمبر یہ بھی ہے:

''(ک) الحاق مدارس دینیہ: ملتان اور بیرون ملتان میں ان مداس دینیہ کا جو مسلک ومشرب مندرجہ دفعہ ۲ کے مطابق ہوں مدرسہ خیر المدارس ملتان سے الحاق کرنا اور ان کی سرپرستی قبول کرنا[14]''

خیر المدارس کے آئین اور قواعد پر مشتمل اس کتاب میں پھر آگے جہاں مختلف شعبہ جات سے متعلق تفصیلی قواعد (rules) ذکر کئے گئے ہیں، وہاں تفصیل سے الحاق کی شرائط کو بھی بیان کیا گیا ہے، جن میں سرِ فہرست یہ ہے کہ ان ملحقہ مدارس میں خیر المدارس کا ہی نصاب پڑھایا جائے گا اور امتحان بھی خیر المدارس ہی لے گا[15]۔

خیر المدارس کے دستور میں اس بات کا ذکر ہونا اس لئے بھی اہم ہے کہ وفاق المدارس کے لئے سب سے پہلے اجلاس کے داعی بھی (جیسا کہ اوپر ذکر ہوا) مولانا خیر محمد ہیں، اس لئے دونوں کا آپس میں گہرا ربط بنتا ہے۔ دیوبند میں اس طرح کے تجربے کے بعد ملحقہ مدارس جو پہلے تقریباً شاخوں کا درجہ رکھتے تھے، مستقل اکائی کی حیثیت اختیار کرتے گئے۔ یہاں اس کا امکان موجود تھا، نیز پاکستان میں دیوبند کی طرح کا کوئی بھاری بھرکم ایسا ادارہ موجود نہیں تھا جس کی سرپرستی کو سب قبول کرلیں، اس لئے مربوط نظام قائم کرنے کی ممکنہ صورت یہی تھی کہ ابتدا ہی میں چند بڑے بڑے ادارے اور شخصیات مل کر بجائے کسی ایک ادارے کی سرپرستی قبول کرنے کے، ایک مشترکہ پلیٹ فارم قائم کریں پھر دیگر مدارس بھی اس سے ملحق ہوتے جائیں۔

مدارس کی بقا کا مسئلہ اور علما و دینی حلقوں میں اتحاد کی ضرورت:

وفاق المدارس کے قیام کے بیان کردہ محرکات میں مدارس کے ساتھ، دینی تعلیم کی بقا کا مسئلہ بھی شامل تھا۔ چنانچہ وفاق کے ایک سال کی تکمیل کے بعد، اسکی مجلسِ شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے، اس وقت کے صدرِ وفاق

---

14 آئینہ وآئین وقواعد، ملتان، خیر المدارس

15 آئینہ وآئین وقواعد ص ۷۷

تھا۔ چنانچہ وفاق کے ایک سال کی تکمیل کے بعد، اسکی مجلسِ شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے، اس وقت کے صدرِ وفاق مولانا شمس الحق افغانی نے وفاق کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ بیان کیا کہ قیامِ پاکستان کے بعد کس طرح یہاں مغربیت اور اسلام کی کشمکش پائی جاتی ہے اور اس میں علما کے اتحاد کی کتنی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ترکی اور مصر کے تجربے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مصر میں دینی تعلیم اس لئے بچ گئی کہ وہاں دینی تعلیم جس طرح سے مربوط تھی ترکی میں ایسے نہیں تھی۔ مولانا افغانی کے مطابق پاکستان، مصر اور ترکی سب کی حکومتوں کا رخ ایک ہی ہے، اس لئے دینی تعلیم کے بقا کے لئے اس کا منظّم ہونا ناگزیر ہے، مولانا کے خطاب میں ہے:

> ''ترکی میں اگرچہ مدارس کی تعداد بہت زیادہ تھی، لیکن وہ غیر منظّم تھے، ان میں تنظیم نہ تھی۔ جب معمولی ضرب لگی تو مدارس فنا ہوگئے۔ اب وہاں دس طلبہ علمِ دین کے نہیں ملتے، وہ اسلامی کرنیں مغربیت کی تاریکی میں دب گئیں۔ پاکستان میں بھی یہی خطرہ درپیش ہے، اس لئے وفاق کی تشکیل وقت کا اہم تقاضا ہے[16]۔''

حکومت کے ساتھ تعلقات کی نوعیت:

وفاق کے قیام میں بظاہر حکومت کے کسی مطالبے، اس کی راہنمائی یا دخل اندازی کے ثبوت نہیں ملتے۔ وفاق کا تصور ان مدارس کی اپنی سوچ کا نتیجہ ہے۔ تاہم معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس نے شروع ہی سے مدارس اور حکومت کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ وفاق کے ایک سال کی تکمیل کے بعد صدر وفاق نے مجلس شوریٰ سے اپنے مذکورہ بالا خطاب میں وفاق کی کارکردگی بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا:

> ''وفاق نے ایک سال کے قلیل عرصے میں ۱۵۰ مدارس کو ایک رشتے میں منسلک کر دیا۔ چند ماہ قبل حکومت کی طرف سے حکم ہوا کہ مدارس عربیہ تعداد، املاک، اور اوقاف کے متعلق رپورٹ حکومت کو پیش کریں۔ چنانچہ بہت کم وقت میں قانونی مشیر مہیا کر کے جوابات کا سلیقہ اور طرزِ جوابات قانونی نقطہ نگاہ سے مرتب کر کے فارم چھپوائے اور تمام مدارس کو بھیجے، جس سے مدارس کو بہت سہولت ہوئی اور جوابات بھی ایک قسم کے آئے''۔

[16] مقالات افغانی ۳۵۹/۲، بہاول پور، مکتبہ سید شمس الحق افغانی، شاہی بازار

وفاق المدارس کا نصابِ تعلیم:

اس حصے کو ذکر شدہ مضامین (دینیات، لسانیات، معقولات) کی تین اقسام کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا اور ہر حصے کے تحت آنے والے، ہر مضمون کی شامل نصاب کتب کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔ اس سے پہلے ہم نصاب کے حوالے سے چند عمومی باتوں کا ذکر کریں گے۔

ملاحظات:

- اصل درسِ نظامی میں درسی ساعات (پیریڈز) کی تقسیم موجود نہیں تھی۔ استاد جس کتاب کو یومیہ جتنا وقت چاہتا تھا دے لیتا تھا، اور جتنے عرصے میں چاہتا کتاب ختم کر لیتا تھا۔ وفاق کے نظام میں باقاعدہ ساعات کی تقسیم موجود ہے۔ اس لئے اس میں جس کتاب کے لئے ایک سے زیادہ ساعات مختص ہیں انہیں اتنے ہی حصوں میں تقسیم کر کے الگ الگ نمبر شمار میں ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً فقہ میں 'ہدایہ' کتاب تو ایک ہے لیکن چونکہ اسے تین سالوں میں چار ساعات کے اندر پڑھایا جاتا ہے اور اس کے کل نصاب میں سو سو نمبر کے چار ہی امتحانی پرچے ہوتے ہیں، اس لئے اسے چار خانوں میں ذکر کیا جائے گا۔ یہی حال ترجمہ قرآن کریم کا ہے۔
- بعض کتابیں متعدد سالوں میں شامل نصاب ہیں، لیکن جزوی طور پر انہیں ایک ہی نمبر شمار کیا گیا ہے۔
- کلی یا جزوی ہونے کے لئے معیار، سالانہ امتحان میں اس کتاب سے متعلقہ سوال کو بنایا گیا ہے۔ وفاق کے فارمیٹ میں ہر پرچے میں کل تین سوال ہوتے ہیں۔ بعض میں تینوں سوال ایک ہی کتاب سے متعلق ہوتے ہیں اور بعض میں دو سوال ایک سے اور ایک سوال ایک کتاب سے اور بعض میں تینوں سوال الگ الگ کتابوں سے۔
- وفاق المدارس کے موجودہ نصاب کا دارالعلوم دیوبند کے نصاب سے بھی تقابل کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب اس میں موجود تھی یا نہیں۔ X کے نشان سے مراد یہ ہے کہ یہ کتاب درسِ نظامی کے نصاب میں شامل نہیں تھی۔ Y کا نشان یہ وضاحت کرتا ہے کہ اس کتاب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ دیوبند کے نصاب کے لئے یہاں اس کا وہ نصابِ تعلیم لیا گیا ہے جو مولانا قاری محمد طیب نے دارالعلوم دیوبند کی سڑسٹھ سالہ تاریخ بنام ''مختصر تاریخ دار العلوم

دیوبند‘‘میں ذکر کیا ہے۔ یہ تاریخ انہوں نے ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء کو مرتب کی تھی، اور ۱۳۸۵ھ ۱۹۶۵ء کو نظرِ ثانی کے بعد شائع کی تھی، گویا یہ دارالعلوم دیوبند کا تقریباً اس زمانے کا نصاب ہے جب وفاق المدارس نیا نیا قائم ہوا تھا۔

ا۔ دینیات

قرآن کریم:

نمبر شمار	نام کتاب	زمانہ تالیف	مختصر تعارف	اصل درس نظامی میں موجودگی	دیوبند کے نصاب میں موجودگی
۱	ترجمہ قرآن کریم (دس پارے)		تین سالوں میں پورے قرآن کا اردو ترجمہ مختصر تشریح کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے	X	Y
۲	ترجمہ قرآن کریم (دس پارے)			X	Y
۳	ترجمہ قرآن کریم (دس پارے)			X	Y
۴	تجوید (جمال القرآن فوائد مکیہ)			X	Y
۵	تفسیر جلالین	نویں صدی ہجری	بہت مختصر الفاظ میں قرآن کی تشریح	Y	Y

۶	تفسیر بیضاوی (تین سوالوں میں سے دوسوال)	ساتویں صدی ہجری	زمخشری کی الکشاف اور امام رازی کی تفسیر کبیر کی تلخیص	Y	Y
۷	الفوز الکبیر (شاہ ولی اللہ) التبیان فی علوم القرآن (الصابونی)			X X	Y X

ملاحظات:

- دوسرے سال میں قرآن کا آخری جز پڑھایا جاتا ہے۔ تیسرے سال میں نو اجز۔ اس کے بعد دس دس اجزا، لیکن دوسرے سال (ثانویہ عامہ) میں آخری پارہ جزوی ہے، اس لئے اگلے سال میں دس پارے شمار کر کے اسے مستقل نمبر شمار نہیں کیا گیا۔
- قرآنیات میں اصل درسِ نظامی پر وفاق میں اضافہ: ۵ کتب
- قرآنیات میں دیوبند کے نصاب پر اضافہ: صرف صابونی کی ''التبیان فی علوم القرآن'' جو عصر حاضر میں لکھی گئی کتاب ہے۔
- قرآنیات میں درسِ نظامی سے کمی: صفر
- قرآنیات میں دیوبند کے اصل نصاب سے کمی: صفر
- دیگر علوم وفنون کی طرح قرآنیات پر گذشتہ چند صدیوں میں سامنے آنے والے رجحانات کا تعارف کسی جگہ شامل نہیں ہے۔

حدیث:

نمبر شمار	نام کتاب	زمانہ تالیف	مختصر تعارف	اصل درس نظامی میں موجودگی	دیوبند کے نصاب میں موجودگی
۱	ریاض الصالحین	ساتویں صدی ہجری	اخلاقیات اور فضائل سے متعلق احادیث کا منتخب مجموعہ	X	X
۲	آثار السنن	چودھویں صدی ہجری	حدیث سے فقہ حنفی کے مستدلات اور ان کا دیگر فقہوں کے مستدلات سے تقابل	X	X
۳	مسند امام ابوحنیفہ (تین سوالوں میں سے ایک سوال)		امام ابوحنیفہ کی سند سے مروی احادیث کے مجموعوں میں سے ایک مجموعہ	X	X
۴	مشکوۃ المصابیح جلد اول	آٹھویں صدی ہجری	حدیث کی ایک درجن سے زائد اہم کتابوں سے انتخاب، اسانید حذف کرکے	Y	Y
۵	مشکوۃ المصابیح جلد دوم			Y	Y

۶	صحیح البخاری	تیسری صدی ہجری		X	Y
۷	صحیح مسلم			X	Y
۸	سنن ترمذی			X	Y
۹	سنن ابوداؤد			X	Y
۱۰	سنن نسائی، سنن ابن			X	
	ماجہ ، شمائل ترمذی (تینوں سے ایک ایک سوال)				
۱۱	موطا مالک ، موطا محمد ، شرح معانی الآثار طحاوی (تینوں سے ایک ایک سوال)			X	Y
۱۲	خیرالاصول شرح نخبۃ الفکر	پہلی معاصر، دوسری کتاب آٹھویں صدی ہجری		X	Y

ملاحظات:

- حدیث میں درسِ نظامی پر اضافہ: ۱۱
- حدیث میں دیوبند پر اضافہ: ۲ (ریاض الصالحین، آثار السنن)
- درسِ نظامی سے کمی: صفر
- دیوبند سے کمی: صفر

فقہ واصول فقہ:

۱	مختصر القدوری	پانچویں صدی کا آغاز	فقہ حنفی کا متن ، جس میں فقہی احکام کو بہت سادہ اور واضح اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔	X	Y
۲	کنز الدقائق	اواخر ساتویں صدی وآغاز آٹھویں صدی	فقہ حنفی کا انتہائی گنجلک اور پیچیدہ متن	X	Y
۳	شرح الوقایہ	آٹھویں صدی		Y	Y
۴	الہدایۃ جلد اول	چھٹی صدی	تقریباً چوتھی صدی ہجری سے فقہ اسلامی خصوصاً فقہ حنفی کا تعلیل reasoning کا دور شروع ہوتا ہے، اس حوالے سے یہ پچھلے کام کا خلاصہ ہے جس میں بہت نپی تلی قانونی زبان استعمال کی گئی ہے	Y	Y
۵	الہدایۃ جلد دوم				
۶	الہدایۃ جلد سوم				
۷	الہدایۃ جلد چہارم				

۸	السراجی فی المیراث	ساتویں صدی ہجری	علم میراث کی کتاب، جس میں حصوں کی تقسیم کے لئے قدیم طریقہ حساب استعمال کیا جاتا ہے	X	Y
۹	اصول الشاشی	چوتھی صدی ہجری	حنفی اصول فقہ پر نظام الدین الشاشی (م۳۴۴ھ) کی تصنیف۔	X	Y
۱۰	نورالانوار	گیارہویں صدی	دورِ عالمگیری کے معروف عالم ملا جیون کی اصول فقہ کے متن ''المنار'' پر شرح۔ برصغیر کی ان گنی چنی کتابوں میں سے جو درس نظامی میں شامل ہیں	Y	Y
۱۱	مختصر الحسامی	ساتویں صدی	اصول فقہ میں ایک مختصر اور نپی تلی کتاب	X	Y
۱۲	التوضیح مع التلویح	آٹھویں صدی		Y	Y

ملاحظات:

- نورالانوار کے علاوہ فقہ/ اصول فقہ میں آٹھویں صدی ہجری کے بعد کی کوئی کتاب شامل نہیں۔
- پانچویں صدی سے پہلے کی بھی کوئی کتاب شامل نہیں، حالانکہ دوسری سے چوتھی صدی تک فقہ اسلامی کے ارتقا کا شاندار دور ہے۔

- خلافتِ عثمانیہ کے دور میں فقہ اسلامی کی قانونی انداز سے تدوین ہوئی، اس کے بعد فقہ واصولِ فقہ کے مطالعہ کے متعدد رجحانات سامنے آئے۔ بعض تو مستقل علم کی حیثیت اختیار کر گئے لیکن نصاب میں ان کا کوئی تعارف شامل نہیں۔
- فقہ/ اصول فقہ میں درسِ نظامی پر اضافہ: ۵
- دیوبند پر اضافہ: صفر
- درس نظامی سے کمی: ۱(ملا محبّ اللہ بہاری کی اصولِ فقہ پر کتاب ''مسلم الثبوت'' جو فقہی واصولی سے زیادہ فلسفی انداز میں پڑھائی جاتی تھی)
- دیوبند سے کمی: ۱(دیوبند کے نصاب میں رسم المفتی یعنی اصول افتا مستقلاً شامل تھا)

عقائد وکلام:

۱	العقیدۃ الطحاویۃ	دوسری تیسری صدی	مشہور محدث طحاوی کی لکھی ہوئی کتاب جس میں مختصر انداز میں اسلامی عقائد کا بیان ہے، حنفی اور سلفی مکاتبِ فکر میں یکساں مقبول۔	X	Y
۲	شرح العقائد النسفیۃ	آٹھویں صدی ہجری	عقلی رنگ زیادہ غالب ہے	Y	Y

ملاحظات:

- جدید کلام یا جدید فکری مباحث کا تعارف شامل نہیں
- عقائد وکلام میں درس نظامی پر اضافہ: ۱ (العقیدۃ الطحاویۃ)

- درسِ نظامی سے کمی: ۳ (شرح عقائد جلالی، شرح مواقف، رسالہ میر زاہد)
- دیوبند پر اضافہ: ۱
- دیوبند سے کمی: ۱ (المسامرۃ)

۲-عربی زبان وقواعد

عربی گرامر (صرف، نحو):

۱	میزان الصرف ، منشعب (فارسی) /علم الصرف (اردو)	معاصر	ابتدائی صرف (morphology) کی فارسی کتب، آج کل عموما ان کے اردو تراجم یا متبادل پڑھاے جارہے ہیں	Y	Y
۲	علم الصیغہ	تیرہویں صدی ہجری	اصل کتاب فارسی میں ہے، وفاق کی طرف سے اس کا عربی ترجمہ پڑھانے کی بھی اجازت ہے	X	Y
۳	نحو میر/علم النحو			Y	Y
۴	ہدایۃ النحو			Y	Y
۵	کافیہ			Y	Y
۶	شرح جامی			Y	Y

ملاحظات:

- درسِ نظامی پر اضافہ: ۱
- درسِ نظامی سے کمی: ۱(شافیہ ابن حاجب)
- دیوبند پر اضافہ: ۰
- دیوبند سے کمی: ۰

بلاغت:

۱	دروس البلاغۃ	چودھویں صدی		X	X
۲	مختصر المعانی	آٹھویں صدی		Y	Y

- دروس البلاغۃ جو ماضی قریب کی تالیف ہے کا درسِ نظامی اور دیوبند پر اضافہ
- مطول جو علامہ تفتازانی کی تلخیص المفتاح پر طویل شرح ہے کی درسِ نظامی سے کمی
- اپنے ارتقا کے اعتبار سے تنقیدِ ادب (النقد الادبی) پہلے وجود میں آئی بلاغت میں، تاہم مقدم الذکر کا کوئی تعارف نصاب میں شامل نہیں ہے۔

عربی ادب وزبان:

۱	الطریقۃ العصریۃ فی تعلیم اللغۃ العربیۃ	معاصر		X	X
۲	القراۃ الراشدۃ، معلم الانشاء	معاصر	ندوۃ العلما کی تیار کردہ	X	X
۳	نفحۃ العرب، معلم الانشاء	چودھویں صدی		X	Y
۴	مقامات الحریری	پانچویں چھٹی صدی		X	Y
۵	دیوان المتنبی، السبع المعلقات	چوتھی صدی ہجری/ دورِ جاہلیت		X	X
۶	دیوان الحماسۃ	تیسری صدی ہجری		X	X

- عربی ادب کا عمومی تعارف، ارتقا، تاریخ وغیرہ کا تعارف شامل نہیں
- درسِ نظامی پر اضافہ ۶
- درسِ نظامی سے کمی ۰
- دیوبند پر اضافہ ۴ (دیوبند میں ادب کی یہ کتابیں درسِ نظامی کے بعد تکمیل میں شامل نصاب ہیں)
- دیوبند سے کمی: ۲

۳۔معقولات

۱	تیسیر المنطق ، ایساغوجی، المرقاۃ			Y	Y
۲	شرح تہذیب			Y	Y
۳	قطبی			Y	Y
۴	ہدیۃ سعیدیہ			X	Y
۵	فہم فلکیات			قدیم ہیئت کی کتب	قدیم ہیئت کی کتب

- اصل درسِ نظامی میں صرف منطق استخراجی شامل تھی، اب کتابوں کی تعداد اگرچہ کم ہوگئی ہے تاہم نوعیت وہی ہے، منطق استقرائی کی کوئی کتاب شامل نصاب نہیں
- درس نظامی پر اضافہ :۲
- درسِ نظامی سے کمی: :۱۰
- دیوبند پر اضافہ: :۱ (فہم فلکیات جو فلکیات پر مشتمل ہے، دیوبند میں اس کی بجائے قدیم فلکیات کی کتاب تصریح شامل تھی)۔
- دیوبند سے کمی: :۴ (میر قطبی، سلم العلوم، ملاحسن، میبذی)

ارتقائی جائزہ:

اگرچہ ہر شعبہ علم کے ساتھ یہ دکھادیا گیا ہے درسِ نظامی، دیوبند اور وفاق میں اس شعبے میں کتنی کتابوں کا اضافہ یا کمی ہوئی، جس سے ہر ایک میں ترجیحات کے رخ کا اندازہ ہوسکتا ہے تاہم آخر میں یہاں چند چارٹس پیش کئے جارہے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوسکے گا کہ درسِ نظامی سے لے کر دیوبند سے ہوتے ہوئے موجودہ نصاب تک کا ارتقائی سفر کس طرح طے ہوا اور اس میں مذکورہ تین قسم کے مضامین (دینیات، زبان سے متعلق کتب، منطق وفلسفہ وغیرہ) کی ترجیحی ترتیب کس طرح بدلتی رہی۔

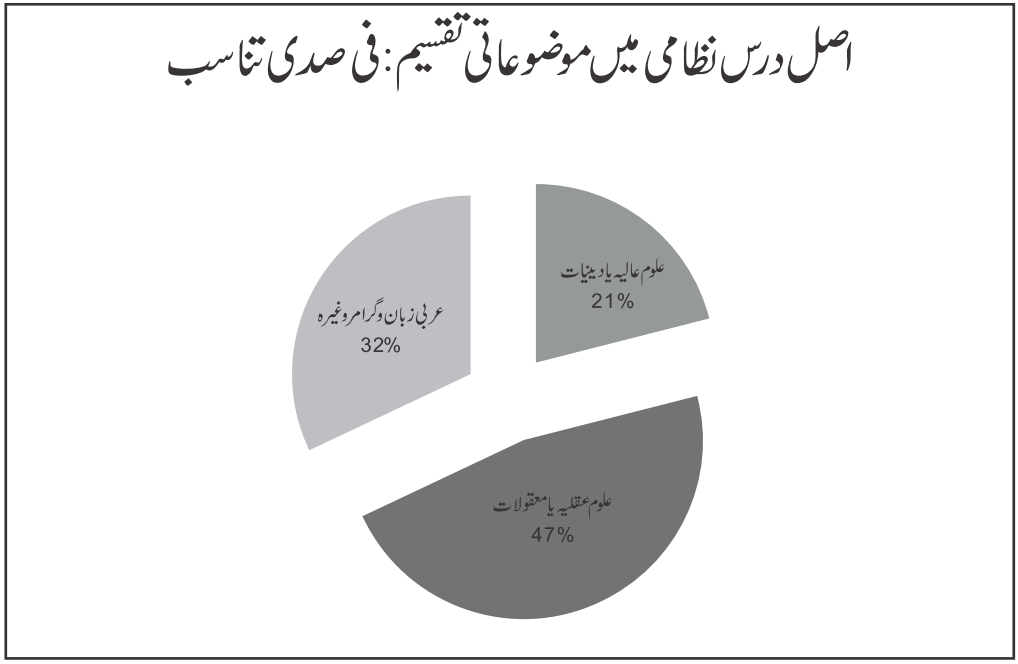

دیوبند کے نصاب ۱۹۶۵ میں موضوعاتی تقسیم

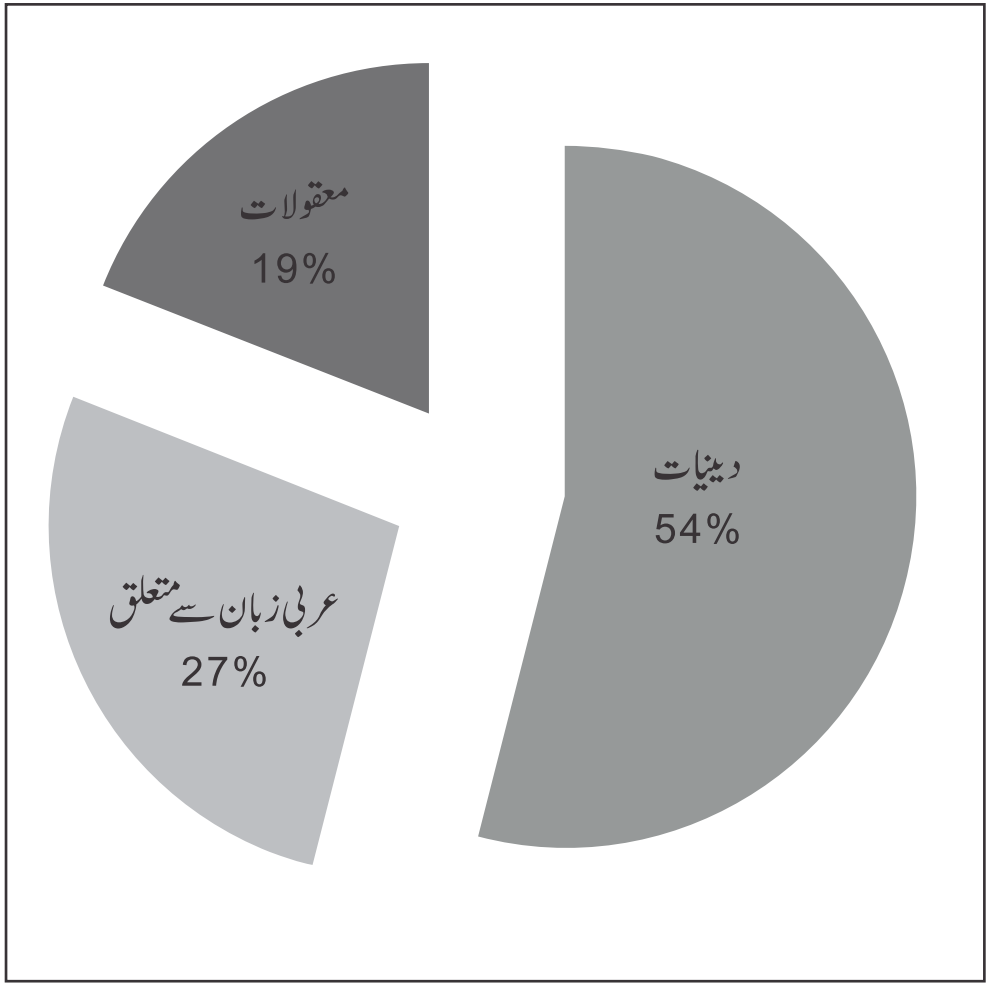

وفاق المدارس کے موجودہ نصاب میں موضوعات کی تقسیم: فیصدی تناسب

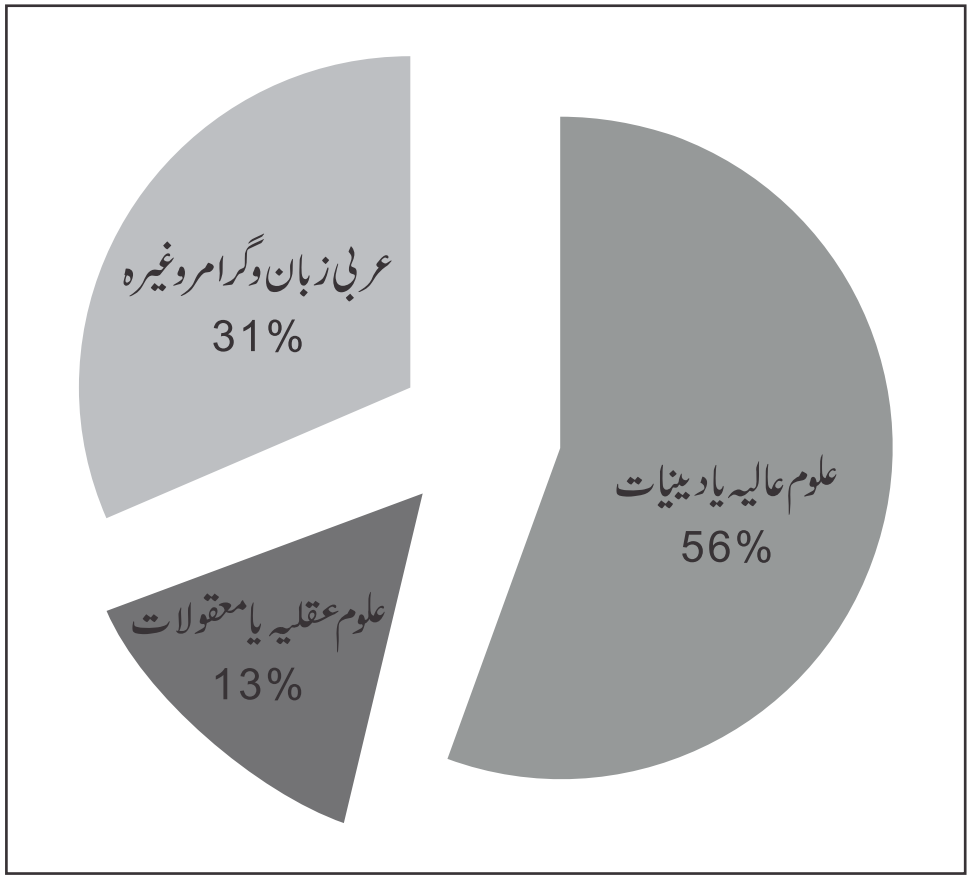

وفاق المدارس اور درس نظامی موضوعاتی تقسیم کا تقابل

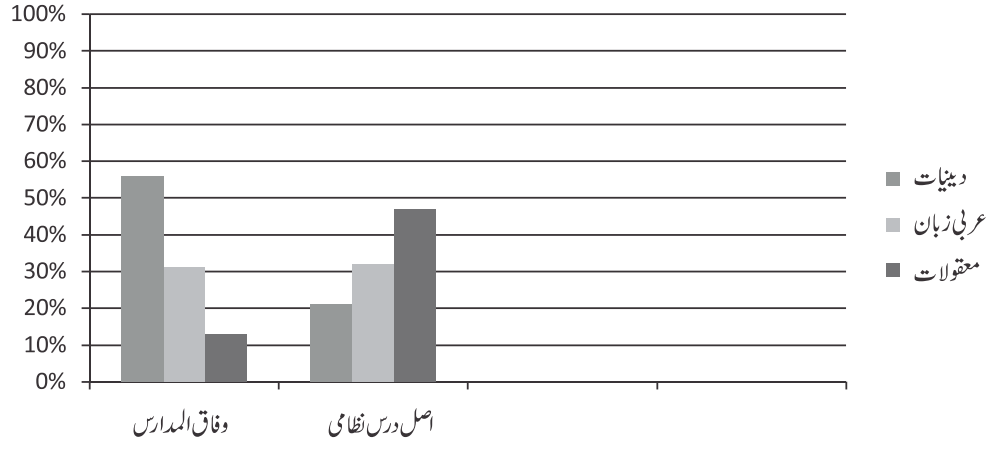

وفاق المدارس اور دارالعلوم دیوبند 1965 موضوعاتی تقسیم کا تقابل

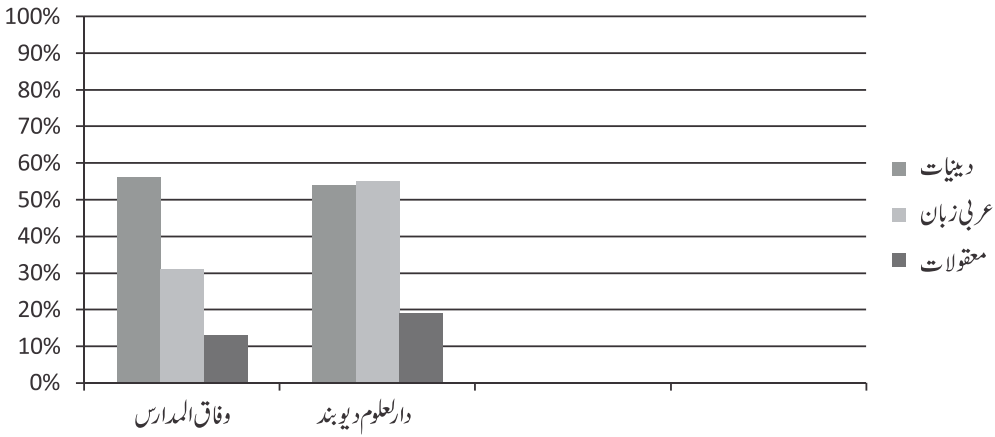

درس نظامی، دیوبند، وفاق موضوعاتی تقسیم تقابلی جائزہ

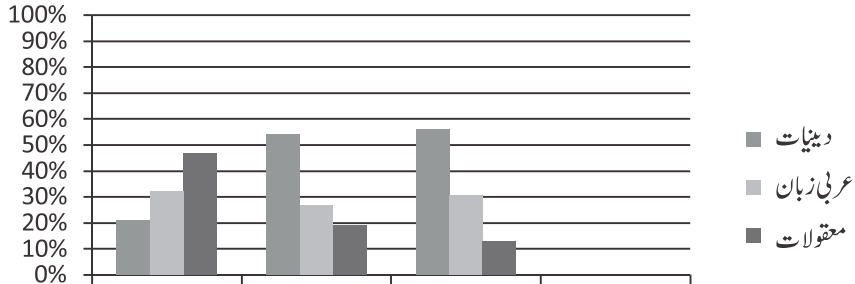

	درس نظامی	دارالعلوم دیوبند	وفاق المدارس	
دینیات	21%	54%	56%	
عربی زبان	32%	27%	31%	
معقولات	47%	19%	13%	

ان چارٹس میں عربی زبان وگرامر اصل درسِ نظامی اور وفاق میں تقریبا برابر نظر آرہے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ اصل مد میں ساری ہی کتابیں گرامر اور گرامر کی عقلی توجیہات پر مشتمل تھیں۔ عربی زبان ادب کی براہِ راست کوئی کتاب نہیں تھی، جبکہ وفاق کے نصاب میں عربی سے متعلق کل ۱۴ کتابوں میں سے ۶ عربی گرامر، ۶ عربی زبان وادب اور دو بلاغت کی ہیں۔

بابِ دوم

درسِ نظامی (وفاق المدارس)

نصاب کا تنقیدی جائزہ

باب اوّل میں، وفاق المدارس کے مروجہ نصابِ تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نکتہ سامنے آیا کہ تاریخی طور پر، اس کی بنیاد اس نصاب پر رکھی گئی تھی جسے کوئی ڈھائی صدیاں قبل برصغیر میں ملا نظام الدین سہالوی نے اس وقت کے رائج علوم وفنون کی تدریس کے لیے مرتب کیا تھا۔ بدلتی ہوئی دینی وتعلیمی ضروریات کے تناظر میں بیسویں صدی کے آغاز میں ، دینی روایت سے وابستہ بڑے اہل علم نے اس نصاب کی اصلاح اور اس میں ترمیم واضافہ کے ضرورت کی طرف متوجہ کرنا شروع کیا تو عمومی سطح پر اس تجویز کی مخالفت ومزاحمت کی آوازیں زیادہ سنائی دیتی رہیں اور سخت یا نرم لہجوں میں اس پر گوناگوں تحفظات کا اظہار کیا گیا۔ نصاب میں تبدیلی کے خلاف بنیادی استدلال اس نصاب کی تاریخی اہمیت اور افادیت سے کیا گیا۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ:

> ''دینی مدارس کے نصاب تعلیم کی بنیادی اور اصولی چیزوں کو نہ چھیڑا جائے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا قائل نہیں ہوں۔ ایسے ہی نصاب تعلیم نے امام رازیؒ اور امام غزالیؒ پیدا کیے ہیں۔ اسی نصاب تعلیم سے قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند محمود الحسنؒ، شیخ العرب والعجم سید حسین احمد مدنیؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ پیدا ہوئے ہیں۔ درس نظامی کو مربوط کرنے کی ضرورت تو ہے، لیکن موقوف کرنے کی اجازت نہیں[17]۔''

مزید یہ کہ:

> ''ہمارے اکابر نے (درس نظامی میں) جو علم منطق اور علم فلسفہ کی کتابوں کو بطور نصاب

---

[17] ملفوظ مولانا عبدالحق، ''علماء دیوبند کی علمی ومطالعاتی زندگی''، مرتبہ مولانا عبدالقیوم حقانی، ص ۵۲

باقی رکھا ہے اور پڑھاتے چلے آ رہے ہیں، وجہ یہ ہے کہ ان کے پڑھنے سے اجتہادی ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ سوال و جواب، اشکال و اعتراض، مقابلہ و مناظرہ اور اساتذہ کی طویل بحثیں، سوال در سوال اور جواب در جواب کا سلسلہ چلتا ہے تو طلباء کو تشحیذ اذہان حاصل ہوتی ہے اور جو طلباء اس میں رغبت نہیں کرتے اور شوق سے نہیں پڑھتے، ان کے علوم سطحی رہتے ہیں۔ ذکاوت کی تیزی اور علوم میں عمق حاصل نہیں ہوتا[18]''۔

تاہم ترمیم و اضافہ اور اصلاح کے حق میں اٹھائی جانے والی آوازوں میں بھی کئی نامور اہل علم کی آوازیں شامل تھیں جن کا اپنا وزن تھا۔ چنانچہ مخالفت کے باوجود بالفعل اس سمت میں دھیمی رفتار سے سہی، پیش رفت ہوتی رہی اور وقت گزرنے کے ساتھ مختلف حلقوں نے اس میں بتدریج کئی قسم کی تبدیلیاں قبول کر لیں۔ اضافہ جات و ترامیم کے کئی مراحل سے گزرنے کے بعد آج یہ نصاب جس صورت میں پاکستان کے دینی مدارس میں رائج ہے، اسے محض ایک تاریخی نسبت کے حوالے سے ہی ''درس نظامی'' کہا جا سکتا ہے، ورنہ اپنے بنیادی خدوخال، ترجیحات اور مندرجات کے اعتبار سے اس نصاب کی شکل و صورت اور ہیئت کم و بیش اسی فیصد تبدیل ہو چکی ہے۔

نصاب میں اصلاح و ترمیم کا یہ عمل بعد از تقسیم ملک کے دونوں حصوں میں جاری ہے۔ چنانچہ بھارت میں دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں کی جانے والی اصلاحات کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا محمد اللہ خلیلی قاسمی لکھتے ہیں:

> ''دارالعلوم دیوبند کے نصاب کو درس نظامی کا نام دیا جاتا ہے، جو کسی حد تک صحیح کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کو اس نام سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ یہ نصاب بعینہ بارہویں صدی ہجری کا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ دارالعلوم کے اس نصاب کی بنیاد وہی درس نظامی تھا جو قیام دارالعلوم کے وقت عموماً ہندوستانی مدارس و درس گاہوں میں رائج تھا، لیکن دارالعلوم کے قیام کی ابتدا ہی سے درس نظامی جوں کا توں کبھی بھی نصاب نہیں رہا اور بعد میں حالات کے تقاضے کے پیش نظر اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اگر کوئی شخص

---

18 ایضاً ص ۴۱، ۴۰

ملا نظام الدین کے درس نظامی کا آج کے دارالعلوم دیوبند کے نصاب سے موازنہ کرے تو اسے دارالعلوم کے نصاب کو درس نظامی کا نام دینے میں بھی ہچکچاہٹ ہوگی، کیوں کہ اس میں علوم عالیہ کے ساتھ علوم آلیہ کی کتابوں میں بنیادی تبدیلیاں کی گئی ہیں، درس نظامی کی متعدد کتابوں کو بالکل نکال کر دوسری کتابوں کا اضافہ کیا گیا ہے، جب کہ بہت سے موضوعات کی کتابوں کو بدل دیا گیا ہے۔ نصاب دارالعلوم میں زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تغیر وتبدل اور حذف واضافہ کا عمل مسلسل جاری ہے[19]''۔

اسی طرح مولانا شوکت علی قاسمی بستوی لکھتے ہیں:

''بڑے شدومد سے یہ راگ الاپا جاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند وملحقہ مدارس میں قدیم فرسودہ درس نظامی رائج ہے جس میں معقولات کی کتابوں کی بھرمار ہے اور کتب دینیہ خال خال ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ: اس نصاب میں قرآن کریم کی تفسیر کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے، لے دے کے صرف تفسیر جلالین اور بیضاوی شریف کا کچھ حصہ شامل نصاب ہے، لیکن آپ ملاحظہ فرمائیں تیسری جماعت سے ہی تفسیر (ترجمہ قرآن) داخل ہے، سال سوم، چہارم وپنجم میں قرآن کریم کا ترجمہ وتفسیر شامل ہے۔ اس طرح تین سالوں میں پورے قرآن کریم کا اردو ترجمہ مختصر تفسیر اور نحوی وصرفی اجراء وغیرہ مکمل کرایا جاتا ہے۔ پھر تجوید سال اول سے سال ہشتم تک ہر سال لازمی ہے، اسی طرح فقہ کی کتابیں سال اول وہشتم کے علاوہ تمام جماعتوں میں ہیں اور ہشتم یعنی دورہ حدیث شریف میں بھی فقہ السنہ امتیازی شان سے پڑھایا جاتا ہے۔ نیز سیرت، اخلاقیات عقائد کی کتابیں بھی خاصی تعداد میں شامل نصاب ہیں۔ درس نظامی کا ایک نقص یہ بھی بیان کیا جارہا ہے کہ اس میں تاریخ داخل نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا دارالعلوم کے نصاب میں اسلامی اور ملکی

---

[19] ہندوستان میں مسلمانوں کا نصاب تعلیم، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، شمارہ 5، جلد: 94، جمادی الاول–جمادی الثانی 1431 ہجری مطابق مئی 2010ء

تاریخ کی کئی کتابیں داخل ہیں۔ پہلے درس نظامی میں کل دو ہی کتابیں حدیث کی رہی ہوں گی، لیکن اب تو کل ۱۳ کتابیں ہیں۔ تین دورہ حدیث سے قبل اور باقی دورہ حدیث میں، اور حدیث شریف تو دارالعلوم دیوبند میں اس شان سے بحمداللہ پڑھائی جاتی ہے کہ شاید ہی کہیں اور اس طرح پڑھائی جاتی ہو، اور اس طرح شب و روز قال اللہ و قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائیں شاید ہی کہیں بلند ہوتی ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے''۔

ایک بات یہ بھی کہہ دی جاتی ہے کہ دارالعلوم میں عربی ادب پر توجہ نہیں ہے۔ پہلے درس نظامی میں واقعی یہ خلا تھا لیکن اللہ تعالیٰ جزاء خیر عطا فرمائے استاد گرامی، عربی زبان وادب کے عبقری ومثالی معلم حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب قاسمی کیرانوی کو انھوں نے تمرین عربی کا مکمل کورس تیار فرمایا، مختلف معاجم اور لغات مرتب فرمائیں اور عربی زبان وادب کے فروغ کا سامان پیدا فرمادیا۔ اب سال اول ودوم وسوم میں مسلسل تمرین عربی داخل ہے، اور حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب کی نفحۃ العرب، حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کی القراۃ الواضحۃ کے تینوں حصے، حضرت مولانا نورعالم صاحب امینی کی مفتاح العربیہ، اسی طرح بہت سے ملحقہ مدارس میں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب کی قصص النّبیین، القراۃ الراشدہ وغیرہ کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں، ضرورت ہے کہ دیگر مدارس کے ذمہ داران بھی اس جانب خصوصی توجہ مبذول فرمائیں۔ رہیں منطق وفلسفہ کی کتابیں تو دارالعلوم کے نصاب میں منطق کی کل پانچ اور فلسفہ کی ۲ ہی کتابیں موجود ہیں[20]۔

پاکستان کے تناظر میں دیکھا جائے تو نصابی اصلاحات کے اس عمل کا آغاز دینی مدارس کے اولین وفاق، وفاق المدارس العربیہ کے فورم پر ممتاز علماء کی نگرانی میں ہوا، اگرچہ متعدد اکابر اور بزرگ اساتذہ نے اس ترمیم واصلاح کے خلاف تحفظات بھی ظاہر کیے۔ مثلاً مولانا عبدالحق آف اکوڑہ خٹک بیان کرتے ہیں کہ:

''مولانا رسول خان صاحب مرحوم ہمارے پاک وہند کے اکابر علماء دیوبند کے

---

[20] ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ 6، جلد: 91، جمادی الاولی 1428 ہجری مطابق جون 2007

استاد ہیں۔ایک مرتبہ وفاق المدارس کا اجلاس تھا۔ میں بھی اجلاس کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا تو حضرت مرحوم کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی تو انھوں نے وفاق کے طرز عمل (نصاب میں منطق کی کتابوں کو اہمیت نہیں دی جارہی تھی) پر حد درجہ رنج وقلق کا اظہار کیا اور فرمایا ''اس طرح علوم ومعارف کی جڑیں کاٹ دی جائیں گی۔'' غالباً حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ اگر منطق اور فلسفہ کی کتب نصاب سے خارج کر دی گئیں تو پھر امام رازیؒ کی تصنیف سمجھنے اور سمجھانے والا کوئی بھی نہ ملے گا[21]''۔

تاہم اس کے باوجود اصلاحات کا یہ سلسلہ تدریجاً جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔اس ضمن میں مثال کے طور پر ان تبدیلیوں پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا جو ۲۰۰۳ء میں وفاق المدارس العربیہ کی مجلس عاملہ نے نصاب میں کیں۔ ان کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

ا۔ درج ذیل نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا:

- سیرت وتاریخ کے موضوع ثانویہ خاصہ سال اول میں عبدالسلام قدوائی کی ''مختصر تاریخ اسلام'' اور عالیہ سال اول میں ابراہیم شریقی کی ''التاریخ الاسلامی''۔
- علوم القرآن کے موضوع پر عالمیہ سال اوّل میں الشیخ محمد علی الصابونی کی ''التبیان فی علوم القرآن''۔
- جدید فقہی مسائل کے موضوع پر عالمیہ سال اول میں مولانا تقی عثمانی کی ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت''۔
- مقارنۃ الادیان والفرق کے تحت عالمیہ سال اول میں مولانا اللہ وسایا کی ''آئینہ قادیانیت''۔

---

[21] ملفوظ مولانا عبدالحق، ''علماء دیوبند کی علمی ومطالعاتی زندگی'' مرتبہ مولانا عبدالقیوم حقانی، ص ۱۴

۲۔ درج ذیل مضامین میں سابقہ کتب کی جگہ نئی کتب شامل کی گئیں:

- فلسفہ قدیم میں عالیہ سال اول میں ''میبذی'' کی جگہ ''ہدیہ سعیدیہ'' اور ''ہدایت الحکمۃ''۔
- عربی ادب میں عالیہ سال اول میں ''دیوان المتنبی'' کی جگہ سید ابوالحسن علی ندوی کی مرتب کردہ ''مختارات من ادب العرب''۔
- عالیہ سال دوم میں حدیث کے مضمون میں ''کتاب الآثار'' کی جگہ ''موطا امام محمد'' اور ''مسند امام اعظم''۔

۳۔ درج ذیل مضامین میں پہلے سے پڑھائی جانے والی کتب کے ساتھ معاون کتب کا اضافہ کیا گیا:

- ثانویہ عامہ سال اول میں نحوی قواعد کی تمرین کے لیے ''المنہاج فی القواعد والاعراب، النحو الیسیر اور تسہیل النحو''۔
- ثانویہ عامہ سال دوم میں ''ہدایۃ النحو'' کے ساتھ تمرینات از ''تسہیل الادب''۔
- ثانویہ خاصہ سال اول میں ''اصول الشاشی'' سے قبل ''آسان اصول الفقہ''۔
- ثانویہ خاصہ سال دوم کے نصاب میں علم بلاغت کی دو کتابیں ''دروس البلاغۃ'' اور ''تلخیص المفتاح''۔
- عالیہ سال اول میں عقائد کے مضمون میں ''الانتباہات المفیدۃ'' جبکہ سال دوم میں ''العقیدۃ الطحاویۃ''۔
- عالیہ سال اول میں اصول حدیث میں ''خیر الاصول'' اور علم الفرائض میں ''سراجی'' کے ساتھ ''تسہیل الفرائض''۔
- عالمیہ سال اول میں ''ہدایہ'' کے ساتھ اصول افتا پر ''شرح عقود رسم المفتی''۔

۴۔ درج ذیل کتابیں نصاب سے بالکل خارج کر دی گئیں:

- عالیہ سال اول میں علم منطق کی ''سلم العلوم''۔
- عالیہ سال اول میں عربی شاعری کی ''دیوان المتنبی''۔
- عالمیہ سال اول سے علم بلاغت کی کتاب ''مطول''[22]۔

[22] دینی مدارس اور عصر حاضر، مرتبہ: شبیر احمد خان میواتی، ناشر: الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ، ۲۰۰۷، ص ۱۲۶۔۱۲۸

اس تمہیدی گفتگو کی روشنی میں اب اس امر کا جائزہ لیا جائے گا کہ تمام تر مجوزہ اصلاحات اور تبدیلیوں کے بعد دینی مدارس کے موجودہ نصاب تعلیم کی صورت حال اس وقت کیا ہے اور ان میں مزید کس حد تک اور کن کن اصلاحات کی گنجائش اور ضرورت موجود ہے۔

ذیل میں دینی تعلیم کے بنیادی مضامین مثلاً قرآن، حدیث، فقہ، عربی زبان وادب اور علم کلام وغیرہ کے الگ الگ عنوانات کے تحت مدارس کے نصاب تعلیم کا تجزیہ کیا جائے گا۔

تجزیے کی بنیاد اساسی طور پر وفاق المدارس العربیہ کے نصاب پر رکھی گئی ہے، جبکہ حسب ضرورت دیگر وفاقوں کے نصابوں کے ساتھ جزوی موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

قرآن مجید

موجودہ نصاب میں قرآن مجید اور اس سے متعلق علوم کی تدریس کا بنیادی خاکہ یہ سامنے آتا ہے:

۱۔ قرآن مجید کی باتجوید قرأت کے قواعد کی تعلیم کے لیے ابتدائی سالوں میں 'جمال القرآن' اور 'فوائد مکیہ' کی تدریس کی جاتی ہے۔

۲۔ قرآن مجید کا مکمل ترجمہ تفسیری توضیحات کے ساتھ مختلف مراحل میں مکمل پڑھایا جاتا ہے۔

۳۔ ترجمہ قرآن کی تکمیل کے بعد منتہی طلبہ کو 'تفسیر جلالین' مکمل جبکہ 'تفسیر بیضاوی' کا منتخب حصہ پڑھایا جاتا ہے۔

۴۔ اصول تفسیر میں شاہ ولی اللہ کی کتاب 'الفوز الکبیر' شامل نصاب ہے۔

۵۔ علوم القرآن میں علامہ صابونی کی کتاب 'التبیان فی علوم القرآن' جزو نصاب ہے۔

نصاب کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو اہم ترین نکتہ اس نصاب کی ''محدودیت'' کو قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن مجید سے متعلق وسیع ومتنوع علوم ومعارف کے مناسب اور تعارفی مطالعہ کو بھی نصاب میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔

ذیل میں قرآن مجید کے متن، تفسیر اور علوم القرآن کے حوالے سے چند بنیادی اور اہم دائروں کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں مسلم علماء نے گراں قدر تحقیقات کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، لیکن اس پورے مواد اور ان مباحث کو موجودہ نصاب میں کوئی جگہ نہیں دی گئی:

۱۔ متن قرآن سے متعلق علوم

- لغات القرآن
- قرآن مجید کے نحوی اسالیب
- نظم قرآن
- قرآن کا اسلوب استدلال
- قرآن مجید کی زبان کے بلاغی پہلو

۲۔ علم تفسیر

- تفسیر کے ضروری علمی اصول
- تفسیر کے مصادر و مآخذ
- علم تفسیر کا ارتقا
- مختلف تفسیری مناہج، نمائندہ تفسیری لٹریچر کا مطالعہ

۳۔ علوم القرآن

- قرآن مجید کے بنیادی موضوعات
- قرآن کا نزول اور متن کی جمع و تدوین
- ناسخ و منسوخ کی بحث
- اختلافات قرأت کی نوعیت و حیثیت
- شان نزول (اسرائیلیات)
- اعجاز قرآنی

نکتہ نمبر ۲،۳ کے تحت جن پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے حوالے سے یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اگرچہ حالیہ اصلاحات میں ان سے متعلق نصاب میں دو اضافے کیے گئے ہیں، یعنی 'الفوز الکبیر' اور 'التبیان فی علوم القرآن' جو اس

اعتبار سے اہم ہے کہ اس طرح پہلی مرتبہ دینی نصاب میں متن قرآن کے براہ راست مطالعہ سے ہٹ کر قرآن سے متعلق مختلف اصولی وتاریخی مباحث کو جز ونصاب بنایا گیا ہے، تاہم یہ دونوں اضافے اپنے موضوع سے متعلق مباحث کا زیادہ جامعیت کے ساتھ احاطہ نہیں کرتے۔ شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر دراصل اصول تفسیر اور علوم القرآن سے متعلق چند بنیادی مباحث کے محاکمہ کی حیثیت رکھتی ہے جسے علمی سطح پر سمجھنے کے لیے طلبہ کو ان مباحث کا ایک بنیادی تعارف حاصل ہونا چاہیے، جبکہ اس ضرورت کو پورا کرنے والی کوئی کتاب شامل نصاب نہیں۔

اسی طرح الصابونی کی 'التبیان فی علوم القرآن' اس موضوع پر ان کے محاضرات کا مجموعہ ہے جنھیں بعد میں تحریری صورت میں مرتب کرلیا گیا۔ علوم القرآن کے ابتدائی سطح کے تعارف کے لیے تو یہ کتاب مناسب ہوسکتی ہے، لیکن اعلیٰ سطح کی تدریس کے لیے ناکافی اور ناموزوں ہے۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ اس موضوع پر اردو میں لکھی گئی ایک بہتر اور محققانہ کتاب ''علوم القرآن'' (از مولانا محمد تقی عثمانی) کے کچھ حصے وفاق المدارس العربیہ کی طرف سے بنات کے لیے مرتب کیے گئے نصاب میں شامل ہیں، لیکن مدارس کے عمومی نصاب میں اس کا کوئی حصہ شامل نہیں کیا گیا۔

اصول تفسیر، علوم القرآن اور مختلف تفسیری مناہج اور امہات کتب تفسیر کے تعارف کے حوالے سے اہل حدیث مدارس کا نصاب نسبتاً بہتر ہے، چنانچہ اس میں امام ابن تیمیہ کے مقدمۃ فی اصول التفسیر، مناع القطان کی مباحث فی علوم القرآن اور محمد حسین ذہبی کی معروف تصنیف التفسیر والمفسرون (منتخب اجزاء) کو نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے اور یقیناً ان کے مطالعہ سے طلبہ علوم القرآن کے مباحث اور تفسیری مناہج کا بنیادی تعارف حاصل کر سکتے ہیں۔ مزید برآں اہل حدیث مدارس کے نصاب میں تفسیری ذخیرے میں سے بیضاوی کے پارہ اول کے ساتھ ساتھ تفسیر ابن کثیر سے منتخب سورتوں کی تفسیر کو بھی جزوِ نصاب بنایا گیا ہے۔

۴۔ مطالعہ قرآن کے ضمن میں جدید رجحانات

- قرآنی بیانات کا سائنسی مطالعہ
- قرآن سے متعلق مغربی اہل علم کے نظریات
- قرآن کا موضوعاتی مطالعہ

- جغرافیہ قرآنی (قصص القرآن کا تاریخی مطالعہ)
- قرآن اور سابقہ کتب سماویہ کا تقابلی مطالعہ
- لسانیات سے متعلق جدید فکری نظریات کا قرآن پر انطباق

۵۔ قرآن مجید پر اعتراضات وشبہات

- قرآن کے وحی الٰہی ہونے پر شبہات
- متن قرآن کے تاریخی استناد پر مستشرقین کے اعتراضات
- قرآن مجید کی تعلیمات پر عقلی اعتراضات
- قرآن کے بیانات پر تجرباتی ومشاہداتی اعتراضات

۶۔ قرآن مجید کی تعلیم وتدریس وتبلیغ

- تحفیظ القرآن کے اصول
- ترجمہ قرآن کی تدریس کے اصول
- قرآن مجید کے تفسیری مطالعہ کے اصول
- تزکیہ وتربیت کے پہلو سے مطالعہ قرآن کے اصول

یوں قرآن مجید کی تعلیم سے متعلق نصاب کی محدودیت اور طرز تدریس کے نقائص کی وہ صورت حال بڑی حد تک برقرار ہے جس کا شکوہ ڈاکٹر محمود احمد غازی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''تفسیر میں تخصیص کے شعبے متعدد مدارس میں قائم ہیں، لیکن وہ چند ماہ میں پورا قرآن حکیم کسی ایک استاد یا مفسر کے طرز تفسیر کے مطابق سرسری طور پر پڑھا دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان تفسیری پروگراموں کے فارغ التحصیل اصحاب زیادہ سے زیادہ اپنے شیخ کے طرز پر عوامی یا مناظرانہ انداز کا درس قرآن دینے کے قابل تو ہو سکتے ہیں، لیکن ان پروگراموں کے نتیجے میں وہ علوم قرآن، ذخائر تفسیر، تفسیر کے مہتم بالشان مسائل، مناہج

مفسرین، دور جدید میں قرآن پاک پر کیے جانے والے اعتراضات اور شبہات، تاریخ تدوین قرآن اور ان جیسے اہم مسائل سے اکثر ناواقف ہی رہتے ہیں[23]''۔

نصاب کی اس محدودیت کے باعث دینی مدارس کے طلبہ میں وسعتِ نظر پیدا نہیں ہوتی۔ وہ دیگر نقطہ ہائے نظر کے علمی استدلال کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے۔ اس کی وجہ سے وہ جہاں نئی تحقیقات سے استفادہ نہیں کر سکتے وہاں اپنی مسلکی وابستگی میں پختہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ مسلکیت اور فرقہ واریت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اس حوالے سے عالم اسلام کی عصری جامعات کے نصاب کا جائزہ لیا جائے تو وہ مطالعہ قرآن کے مختلف پہلوؤں اور علم تفسیر سے متعلق مباحث کے حوالے سے زیادہ وسیع اور مفید دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جامعہ پنجاب میں قرآنیات کے ایک کہنہ مشق استاد نے بعض پہلوؤں کی طرف یوں توجہ دلائی ہے:

''دینی مدارس کے ساتھ اگر موازنہ کیا جائے تو دیکھنے میں یہ بات آتی ہے کہ یونیورسٹیز میں جو اسٹڈی ہوتی ہے، اس میں مطالعہ متن کے ساتھ قرآن مجید کا موضوعاتی مطالعہ بھی ہوتا ہے۔ یہ بہرحال تسلی اور اطمینان کی بات ہے کہ ہمارے ہاں آیت کی تشریح مانگی جائے یا ٹاپیکل اسٹڈی کی جائے تو دونوں صورتوں میں مطالعہ گہرا ہوتا ہے اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اس میں قدیم اور جدید تمام مکاتب فکر سے طلبہ کو واقفیت حاصل ہو[24]''۔

اسی طرح بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایک پی ایچ ڈی اسکالر، محمد وقاص نے مدارس اور اسلامی یونیورسٹی کے نصاب کا موازنہ کرتے ہوئے چند نمایاں امتیازات کو یوں واضح کیا ہے:

''اصولِ تفسیر کے سلسلے میں اسلامی یونیورسٹی کے نصاب میں اس سلسلے میں اب تک ہونے والی جملہ کاوشوں سے طالب علم کو نہ صرف روشناس کروایا جاتا ہے، بلکہ عملاً اس کو ان سے استفادہ بھی کروایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جدید عرب علما نے جو کام کیا

---

23 ''دینی مدارس میں تخصص اور اعلیٰ تعلیم و تحقیق''، ماہنامہ الشریعہ، جنوری ۲۰۰۸، ص ۹، ۱۰

24 ڈاکٹر حافظ محمود اختر، ''پاکستانی جامعات میں قرآنیات کا مطالعہ''، ماہنامہ الشریعہ، جنوری ۲۰۱۴، ص ۱۳

ہے، اس سے ہماری یونیورسٹیوں میں عمومی شناسائی نہیں ہے۔مثال کے طور پر شیخ عبدالرحمان حسن حبنکہ المیدانی کی ''قواعد التدبر الامثل لکتاب اللہ عزوجل''، خالد بن عثمان السبت کی ''قواعد التفسیر''، خالد عبدالرحمان العک کی کتاب ''اصول التفسیر و قواعدہ'' اور مساعد بن سلیمان الطیار کی ''فصول فی اصول التفسیر'' اس سلسلے کی نہایت اہم اور جامع کتابیں ہیں جس سے ایک طالب علم پہلی بار اصولِ تفسیر اور علوم القرآن کی ابحاث میں واضع امتیازات سے واقف ہوتا ہے۔اسلامی یونیورسٹی میں اصول تفسیر کا استاد ان کتابوں کے منتخب ابواب طلبا میں تقسیم کرتا ہے جس سے اس کو موضوع پر خاطر خواہ واقفیت ہو جاتی ہے۔ مذکورہ بالا کتابوں میں سے کوئی کتاب (مثلاً'' فصول فی اصول التفسیر'') بہ طور نصاب کے طے کر دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ باقی کتابوں سے معاون کتب کے طور پر استفادہ کیا جاتا ہے، اس طرح اس میں مدارس کا قدیم کتابی طرز اور جدید موضوعی طرز خوب صورتی کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں''۔

تاریخ تفسیر کے حوالے سے بھی ہمیں اسلامی یونیورسٹی کے نصاب میں باقی جامعات کے نصاب سے بہت اختلاف دیکھنے کو ملتا ہے۔چنانچہ یہاں ''مناہج المفسرین وتاریخ التفسیر'' کے نام سے مستقل مادہ پڑھایا جاتا ہے جس میں اصل بنیاد کی حیثیت محمد حسین الذہبی کی کتاب ''التفسیر والمفسرون'' کو یا مناہج مفسرین پر لکھی کسی جدید عربی کتاب کو حاصل ہوتی ہے اور معاون کے طور پر دیگر کتابوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔اس نصاب میں طالب مشہور مدارسِ تفسیر، تاریخ کے بڑے بڑے مفسرین، تفسیر ماثور اور تفسیر بالرائے کے رجحانات کے تحت لکھی گئی نمائندہ تفاسیر، تفسیر کے منحرف رجحانات وغیرہ امور سے کافی واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔باقی یونیورسٹیوں میں عام طور پر ذہبی کی کتاب کے ترجموں اور تلخیصوں (جیسے غلام احمد حریری کی ''تاریخ تفسیر اور مفسرین'') پر ہی نصاب کا انحصار ہوتا ہے۔

مذکورہ دو امور کے علاوہ تفسیر میں دخیل (یعنی ماثور میں موضوعات اور اسرائیلیات اور تفسیر بالرائے میں غلط اصولوں کے تحت کی گئی تفسیر)، علوم القرآن، اعجازِ قرآن وغیرہ مستقل مادوں کی حیثیت سے پڑھائے جاتے ہیں، جس

سے ایک طالب علم پہلی بار قرآنیات کے ایک وسیع تنوع سے آشنا ہوتا ہے۔ برصغیر میں تفسیر اور علومِ قرآن ایک مستقل موضوع ہے جو یہاں پڑھایا جاتا ہے۔ متن تفسیر کے حوالے سے بھی اسلامی یونیورسٹی کا نصاب موضوعاتی نوعیت کا ہے۔ مثلاً تفسیر بیانی میں علامہ طاہر ابن عاشور کی ''التحریر والتنویر''، تفسیر کلامی میں ''تفسیرِ رازی''، ماثور میں ''تفسیر نسفی'' وغیرہ تفاسیر کے منتخب حصے داخل نصاب کیے جاتے ہیں جن سے طالب علم تفسیر کی نمائندہ کتابوں کے ذوق سے آشنا ضرور ہو جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلامی یونیورسٹی کا علومِ اسلامیہ (تفسیر وعلومِ تفسیر، حدیث وعلومِ حدیث، فقہ وشریعہ، عقیدہ و کلام، سیرت، تقابلِ ادیان وغیرہ) کا نصاب ایک مستقل تجزیاتی بحث اور نقد کا متقاضی ہے اور پاکستان کی کسی بھی جامعہ کے نصاب کے مقابلے میں زیادہ جامعیت، وسعت، گہرائی اور گیرائی کا حامل ہے[25]۔

علم حدیث

علم حدیث کی تدریس کے حوالے سے وفاق المدارس کے موجودہ نصاب کا خاکہ کچھ یوں ہے:

- ابتدائی درجات میں مختصر رسائل جیسے ''جوامع الکلم''، مرتبہ مولانا مفتی محمد شفیع اور' زاد الطالبین' مرتبہ مولانا محمد عاشق الٰہی۔
- متوسط درجات میں امام نووی کی مرتب کردہ کتاب ''ریاض الصالحین'' سے چند منتخب ابواب جن کا تعلق موعظت ونصیحت اور تربیت اخلاق سے ہے۔ (تنظیم المدارس اور رابطۃ المدارس کے نصاب میں اس مرحلے پر امام نووی کی اربعین، جبکہ اہل حدیث مدارس کے نصاب میں 'نخبۃ الاحادیث' از مولانا داؤد غزنوی شامل کی گئی ہے)۔
- حنفی فقہ کے مسائل کی تائید کے نقطہ نظر سے مرتب کردہ بعض مجموعے، جیسے 'مسند امام اعظم' (اس سے قبل نیموی کی 'آثار السنن' اور شیبانی کی 'کتاب الآثار' بھی پڑھائی جاتی رہی ہیں)۔

(اہل حدیث مدارس میں اس طرز کی نصابی کتب بالکل ابتدائی درجات میں شامل ہیں، جیسے ثانویہ عامہ میں بلوغ المرام از ابن حجر عسقلانی)۔

---

[25] ماہنامہ الشریعہ، فروری ۲۰۱۴، ص ۵۵-۳۵

- خطیب تبریزی کا مرتب کردہ جامع مجموعہ احادیث، مشکوٰۃ المصابیح۔ (یہ کتاب سبھی مکاتب فکر کے ہاں شامل نصاب ہے، البتہ دیوبندی مدارس میں اس کی تدریس منتہی طلبہ کو کی جاتی ہے، جبکہ بریلوی اور اہل حدیث مدارس نیز رابطۃ المدارس میں یہ ثانویہ خاصہ یا عالیہ کے نصاب کا حصہ ہے)۔
- انتہائی درجات میں دورہ حدیث جس میں صحاح ستہ اور چند دیگر متون حدیث کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ (اہل حدیث مدارس میں صحاح ستہ کی بعض کتب کی تدریس کا آغاز نسبتاً جلدی کر دیا جاتا ہے، چنانچہ سنن نسائی ثانویہ خاصہ میں جبکہ جامع ترمذی اور سنن ابی داود عالیہ کے نصاب میں شامل کی گئی ہیں)۔
- اصول حدیث کے موضوع پر علامہ ابن حجر کا رسالہ ''شرح نخبۃ الفکر'' جو منتہی طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے۔ (بریلوی اور اہل حدیث مدارس کے نصاب میں اصول حدیث کی تدریس ابتدائی درجات میں شروع کر دی جاتی ہے۔ مثلاً اصول حدیث از محمد اویس بلگرامی اور اصطلاحات المحدثین از سلطان محمود، بالترتیب، اہل حدیث مدارس کے ثانویہ عامہ و ثانویہ خاصہ کے نصاب میں شامل ہیں جبکہ بریلوی مدارس میں ثانویہ خاصہ میں مقدمہ مشکوٰۃ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی پڑھایا جاتا ہے۔ اہل حدیث مدارس میں انتہائی درجات میں شرح نخبۃ الفکر کے ساتھ محمود الطحان کی تیسیر مصطلح الحدیث بھی شامل نصاب ہے)۔

اصول حدیث میں احناف کے منہج کا کوئی خصوصی مطالعہ وفاق کے نصاب میں شامل نہیں جو حیرت انگیز ہے۔ دلچسپ چیز یہ ہے کہ مولانا ظفر احمد عثمانی کا مقدمہ 'اعلاء السنن' رابطۃ المدارس کے نصاب میں تو شامل کیا گیا ہے لیکن دیوبندی مدارس کے نصاب کا حصہ نہیں۔

علم حدیث کے دائرے میں بنیادی قابل توجہ بات یہ ہے کہ ذخیرۂ حدیث سے متعلق متنوع علوم وفنون اور اس علم کے ارتقا و تشکیل کا کوئی جامع تعارفی مطالعہ نیز حجیت حدیث سے متعلق معاصر کلامی مباحث پر کوئی باقاعدہ کتاب وفاق المدارس کے نصاب میں شامل نہیں، اگرچہ دورہ حدیث میں امہات کتب کی تدریس کے آغاز میں ان مباحث پر ایک عمومی گفتگو کی جاتی ہے۔ ان پہلوؤں پر رابطۃ المدارس اور اہل حدیث مدارس کے نصاب میں البتہ توجہ دی گئی ہے، چنانچہ رابطہ کے نصاب میں مولانا مودودی کی ''سنت کی آئینی حیثیت'' اور سید مناظر احسن گیلانی کی ''تدوین حدیث''،

جبکہ اہل حدیث مدارس کے نصاب میں مصطفیٰ السباعی کی ''السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی'' شامل ہیں۔
تاہم یہ کتابیں ذخیرہ حدیث کے استناد کے حوالے سے مستشرقین کے ہمہ جہت اعتراضات کا احاطہ نہیں کرتیں، مثلاً یہ اعتراضات کہ:

۱۔ دورِ اوّل کے مسلمان حدیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے، مسلمانوں میں یہ خیال بعد کے دور میں پیدا ہوا۔ پیغمبر رسول ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد ان کے پیروکاروں کی بڑھتی ہوئی جماعت نے محسوس کیا کہ مذہبی اور معاشرتی زندگی میں بے شمار ایسے مسائل ہیں جن کے متعلق قرآن میں کوئی راہنمائی موجود نہیں ہے، لہٰذا ایسے مسائل کے حل کے لیے احادیث کی تلاش شروع کی گئی۔

۲۔ ابتدا میں لوگ مختلف اقوال اور افعال کو حضرت محمد ﷺ کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔ ان کی نسبت ثابت کرنے کے لیے بعد میں دوسری صدی کے آواخر یا تیسری صدی کے شروع میں اسناد گھڑنے کا آغاز ہوا۔

۳۔ بہت سی روایات یہود و نصاریٰ کی کتب سے متاثر ہو کر گھڑی گئی ہیں۔ مثلاً محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ ان کے پاس معجزات دکھانے کی قوت ہے، لیکن سینکڑوں حدیثیں ان کے معجزانہ کارناموں کا پتہ دیتی ہیں جس سے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اکثر احادیث عیسائی تعلیمات کے زیر اثر تشکیل پذیر ہوئیں۔

۴۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی کتابت سے منع کر دیا تھا، اس لیے دورِ اوّل کے علماء نے علم حدیث کی حفاظت میں سستی اور لاپرواہی سے کام لیا جس کے نتیجہ میں احادیث یا تو ضائع ہو گئیں یا پھر ان میں اس طرح کا اشتباہ پیدا ہو گیا ہے کہ پورے یقین کے ساتھ کہنا کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، ممکن نہیں ہے۔

۵۔ حدیث کی جمع و تدوین اور حفاظت میں بنیادی کردار ادا کرنے والی شخصیات وضع حدیث کی مرتکب ہوئیں۔ اس ضمن میں مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہؓ پر وضعِ حدیث کا الزام عائد کیا گیا ہے اور نامور تابعی امام ابن شہاب زہریؒ سے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ بنو اُمیہ کے دینی اور سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے احادیث وضع کیا کرتے تھے۔ عراقی فقہا پر الزام لگایا گیا کہ ان کے زمانے میں مسلمانوں میں جو بھی عمل جاری تھا، اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دینے کا رجحان تھا تاکہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویب حاصل ہو جائے، خواہ احادیث اس عمل کی تائید

فقہا پر الزام لگایا گیا کہ ان کے زمانے میں مسلمانوں میں جو بھی عمل جاری تھا، اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دینے کا رجحان تھا تا کہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویب حاصل ہو جائے، خواہ احادیث اس عمل کی تائید کرتی ہوں یا نہ کرتی ہوں۔

حدیث کی تدریس کے حوالے سے موجودہ نصاب کا سب سے اہم اور امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں امہات کتب حدیث کے متون کا سبقاً سبقاً مطالعہ کیا جاتا ہے جس سے احادیث کا کم وبیش دو تہائی ذخیرہ طلبہ کی نظر سے گزر جاتا ہے۔ تاہم اتنے بڑے اور قیمتی ذخیرے کی تدریس کے لیے عموماً جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اس کے مختلف پہلوؤں کی اصلاح کے ضمن میں اہل علم اپنے تبصرے اور تجزیے پیش کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں اس ضمن کی چند نمائندہ تنقیدات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

> ''دورہ حدیث کے لیے ایک سال کے مختصر وقت میں حدیث پاک پڑھنے پڑھانے کا حق ادا نہیں ہو پاتا۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ حدیث کے صرف معدودے چند ابواب تحقیق وتفصیل کے ساتھ ہو جاتے ہیں کہ سال ختم ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد کے حصے، تکمیل نصاب کی بھاگ دوڑ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ استاد اور شاگرد آخر سال میں انتہائی بھاگ دوڑ پر مجبور ہو جاتے ہیں، حالانکہ صحیح بخاری کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں جسے رواروی میں گزار دیا جائے[26]''۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا:

> ''تعلیم حدیث جیسی کہ محدث بننے کے لیے درکار ہے، کہیں نہیں دی جاتی۔ درس حدیث کا جو طریقہ ہمارے ہاں رائج ہے، وہ یہ ہے کہ جب فقہی اور اعتقادی جھگڑوں سے متعلق کوئی حدیث آ جاتی ہے تو اس پر دو دو تین تین دن صرف کر دیے جاتے ہیں۔ باقی

[26] ہمارا تعلیمی نظام، ص ۵۰۱

الاقوامی قانون پر روشنی پڑتی ہے، ان پر سے استاد اور شاگرد سب اس طرح رواں دواں گزر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی بات قابل توجہ ہے ہی نہیں[27]''۔

معاصر تہذیبی سوالات کے تناظر میں مطالعہ حدیث کے توجہ طلب پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا زاہد الراشدی نے لکھا ہے:

''دوسرا پہلو جو ارباب علم و دانش کی ترجیحی توجہ کا مستحق ہے، وہ آج کا عالمی ماحول ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گلوبلائزیشن کا دور ہے اور تہذیبوں کے اختلاط کا دور ہے کیونکہ فاصلے اس قدر سمٹ گئے ہیں کہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان صدیوں سے قائم سرحدیں پامال ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ آج کے دور میں جبکہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان حدود اور فاصلوں کو برقرار رکھنا ممکن نہیں رہا، منطقی طور پر یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے کہ مختلف تہذیبوں کے اختلاط کے دور میں اسلام کیا راہنمائی کرتا ہے؟ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات میں اس بارے میں واضح راہنمائی موجود ہے اور احادیث کے ذخیرے میں بہت سی روایات پائی جاتی ہیں۔ دور نبوی ﷺ کے اس طرز کے واقعات اور روایات و احادیث کی روشنی میں آج کے عالمی حالات کے تناظر میں اصول و ضوابط وضع کرنے چاہیں کہ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے تال میل میں کہاں ایڈجسٹمنٹ کی گنجائش ہے، کہاں صاف انکار کی ضرورت ہے اور کہاں کوئی درمیان کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ یہاں میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم نے دین اور ثقافت کے درمیان حد فاصل قائم نہیں رہنے دی اور بہت سے معاملات میں دونوں کو گڈمڈ کر دیا ہے حالانکہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے[28]''۔

---

[27] تعلیمات، ص ۱۸۱

[28] عصر حاضر میں اجتہاد، ص ۱۴۲، ۲۴۲

مطالعہ حدیث کے بعض جدید پہلوؤں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مولانا مفتی محمد زاہد لکھتے ہیں:

''عصر حاضر میں مشکل الحدیث سمیت حدیث کے معنوی پہلو پر کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت بھی بڑھ گئی بلکہ چیلنج کی شکل اختیار کی گئی ہے اور اس کام کے لیے آسانیاں اور امکانات بھی زیادہ ہوگئے ہیں۔ ضرورت تو اس لیے بڑھ گئی ہے کہ نظامِ کائنات سے متعلق احادیث میں جن موضوعات پر بات کی گئی ہے، ان میں سے کئی چیزوں کے بارے میں گزشتہ زمانوں میں بیشتر طبعی علوم یا تو خاموش تھے یا ان کے پیش کردہ نظریات محض تخمینوں پر مبنی تھے، اس لیے ان نظریات کو بجا طور پر علمی اعتبار سے غیر ثابت شدہ قرار دے دیا جاتا تھا۔ اب ان میں سے کئی امور پر جدید سائنس نے نہ صرف سکوت توڑا ہے بلکہ محض تخمینوں کی بجائے تجربے اور استقرا پر مبنی نظریات پیش کر دیئے ہیں۔ اب گویا ان میں سے کئی امور عقلی ثبوت کے اس درجے تک پہنچ چکے ہیں جس سے نقلِ صحیح کا تعارض نہیں ہوسکتا۔ اب احادیث مبارکہ میں دی گئی معلومات اور ان سائنسی نظریات کا تقابلی مطالعہ ضروری ہوگیا ہے۔ اب ان نظریات کو غیر ثابت شدہ کہہ کر نہ ماننے والی بات چلنے والی نہیں۔ اسی طرح سوشل سائنسز میں اب عقلی اعتبار سے مجرد عقلی مقدمات ملانے کو کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اکثر باتوں کو ان کے نتائج و آثار کے حوالے سے پرکھا جاتا ہے، اور آثار و نتائج پرکھنے کے لیے خالص اندازوں اور تخمینوں کی بجائے شماریاتی طریقوں پر بھی انحصار کیا جاتا ہے[29]''۔

علم فقہ

دینی تعلیم کے موجودہ نصاب میں حدیث کے بعد سب سے اہم مضمون علم فقہ ہے۔ اس مضمون کی تدریس عموماً

[29] مولانا مفتی محمد زاہد، ''تدریس حدیث اور عصر حاضر کے تقاضے''، الشریعہ، مئی ۲۰۰۹، ص ۴۲

درج ذیل مراحل میں کی جاتی ہے:

۱۔ فقہ حنفی کے مختصر متون جیسے 'قدوری' اور 'کنز الدقائق'

۲۔ متون کی متوسط و مفصل شروح، جیسے 'شرح الوقایہ' اور 'الہدایہ' نیز علم الفرائض میں السراجی۔

۳۔ حنفی اصول فقہ کی مختصر و متوسط کتب، جیسے اصول الشاشی، نور الانوار اور الحسامی وغیرہ، نیز التوضیح والتلویح کے منتخب حصے۔

۴۔ کتب حدیث کی تدریس کے ضمن میں فقہاء کے مابین اختلافی مسائل پر تفصیلی مباحث

اس دائرے میں موجودہ نصاب کے نمایاں نقائص کو درج ذیل نکات کی صورت میں واضح کیا جاسکتا ہے:

۱۔ علم فقہ کی تشکیل وارتقا، چودہ صدیوں میں اس کے مختلف ادوار، متنوع فقہی مکاتب فکر اور رجحانات اور اسلامی تاریخ کے نامور مجتہدین وفقہاء کے افکار وخدمات کے تعارفی مطالعہ پر مبنی کوئی کتاب نصاب میں شامل نہیں۔ اس ضمن میں واحد استثناء اہل حدیث مدارس کا نصاب ہے جس میں فقہ کی عمومی تاریخ کے موضوع پر مناع القطان کی تاریخ 'التشریع الاسلامی' جبکہ بعض فقہی واجتہادی رجحانات کے آغاز اور باہمی امتیازات کی تفہیم کے لیے شاہ ولی اللہؒ کی 'حجۃ اللہ البالغۃ' کے منتخب حصے نصاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

۲۔ فقہی ذخیرے کی تدریس کے ضمن میں موجودہ نصاب صرف ایک فقہ یعنی فقہ حنفی کے گرد گھومتا ہے۔ دیگر فقہی مذاہب کا براہ راست مآخذ کی روشنی میں معروضی مطالعہ کسی بھی درجے میں شامل نصاب نہیں۔ اس کی وجہ سے مسلکی تعصب پیدا ہوتا ہے اور گروہی تقسیم بڑھتی ہے۔ اس حوالے سے بھی اہل حدیث مدارس میں عمومی رجحان سے ہٹ کر السید سابق کی کتاب 'فقہ السنۃ' کے بعض ابواب نیز ابن رشد کی 'بدایۃ المجتہد' شامل نصاب کی گئی ہے جو کسی مخصوص فقہی مسلک کی ترجمانی نہیں کرتی۔

۳۔ فقہ حنفی کے مطالعہ کے لیے بھی دور متوسط (چوتھی، پانچویں صدی) یا دور متاخر کے رجحانات کی نمائندہ کتب کا انتخاب کیا گیا ہے جس سے خود فقہ حنفی کے دائرے میں پائے جانے والے مختلف رجحانات اور خاص طور پر اس کی تشکیل کے ابتدائی ادوار میں فقہائے احناف کے طرز فکر سے واقفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس پہلو کی طرف

خود ماضی قریب کے بلند پایہ حنفی علماء نے بھی متوجہ کیا ہے۔

۴۔ ذخیرہ حدیث میں بیان ہونے والے فقہی احکام اوران سے متعلق آئمہ مجتہدین کے استنباطات واختلافات پر کتب حدیث کی تدریس کے ضمن میں کافی بحث ہو جاتی ہے،لیکن قرآن مجید کی آیات الاحکام کو اسی طریقے پر خصوصی مطالعے کا موضوع نہیں بنایا گیا۔اس ضمن میں صرف اہل حدیث مدارس کے نصاب میں اس پہلو پر توجہ دی گئی اورنواب صدیق حسن خان کی نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام (مکمل) کو جزوِنصاب بنایا گیا ہے۔

۵۔ علم فقہ کے نصاب کی نمایاں ترین خامی یہ ہے کہ اس میں فقہ وشریعت سے متعلق معاصر سوالات ومباحث اور موضوعات کو کلیتًا نظر انداز کیا گیا ہے اور کوئی ایک کتاب بھی ایسی شامل نصاب نہیں جو معاصر قومی وبین الاقوامی عرف کے تناظر میں متعلقہ سوالات کو موضوع بناتی ہو۔اس خلا کی شکایت عرصہ دراز سے مدارس کے جیدترین علماء کرتے آرہے ہیں،لیکن تاحال اس حوالے سے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔

مثال کے طور پر ملکی قوانین کی تعلیم کی ضرورت کے حوالے سے مولانا اشرف علی تھانوی نے کوئی پون صدی قبل لکھا تھا کہ:

> ''یہ میری بہت پرانی رائے ہے اوراب تو رائے دینے سے بھی طبیعت افسردہ ہوگئی،اس لیے کہ کوئی عمل نہیں کرتا۔وہ رائے یہ ہے کہ تعزیرات ہند کے قوانین اور ڈاک خانہ اور ریلوے کے قواعد بھی مدارس اسلامیہ کے درس میں داخل ہونے چاہئیں۔یہ بہت پرانی رائے ہے مگر کوئی مانتا اور سنتا ہی نہیں[30]''۔

ماضی قریب میں یہی شکایت معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اپنے بعض عملی تجربات کے حوالے سے کی ہے۔چنانچہ اسلامی بنک کاری کے لیے درکار رجال[31] کار کی فراہمی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ہم نے شروع میں یہ طے کیا تھا کہ شریعہ اڈوائزر درس نظامی اور مدرسے کا فاضل ہونے کے ساتھ انگریزی اور بینکنگ کا علم بھی رکھتا ہو۔تین مہینے کے بعد بنکوں نے یہ

---

[30] الافاضات الیومیہ،جلد ششم،ص ۵۴۳

شکایت کی کہ ہمیں کوئی ایک بھی (اوراس بات کو میں تاکید سے کہتا ہوں) آدمی ایسا نہیں ملا جو درس نظامی کا فاضل ہونے کے ساتھ انگریزی اور بینکنگ کے مسائل کا علم بھی رکھتا ہو۔ یہ لوگ بورڈ کے پاس آئے کہ اس ضابطے پر نظر ثانی کی جائے اور اب بورڈ اس ضابطے پر نظر ثانی کر رہا ہے تاکہ اس مہارت کے افراد دستیاب ہوسکیں جو بنکوں کے لیے کارآمد ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درس نظامی کے فضلا، ان کے موجودہ نظام کے لیے زیادہ اہل نہیں ہیں۔ ان کے پاس اداروں اور حکومت، نیز قوانین واداروں کے اسلامیانے کے عمل سے وابستہ باڈیز کو راہنمائی فراہم کرنے کے لیے مناسب افراد نہیں ہیں۔ بنگلہ دیش میں ایک بڑا اسلامی بنک کام کر رہا ہے اور یہ اسلامی بنک جدید دنیا کا ایک کامیاب اسلامی بنک ہے۔ اگر اسے دینی محققین کی ایک جماعت کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ بینک مدارس سے یہ مطالبہ کرتا ہے تو میرا خیال نہیں ہے کہ روایتی مدارس کوئی ایسی ماہرانہ کھیپ اسے مہیا کرنے کی پوزیشن میں ہیں[31]''۔

۵۔ علم فقہ کی تعلیم وتدریس کے دائرے میں پائے جانے والے خلا کا ایک بے حد اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ریاستی نظام اور بین الاقوامی قانون کے ضمن میں دور جدید کی جوہری تبدیلیوں سے متعلق اجتہادی زاویہ نگاہ کو اہداف کا حصہ نہیں بنایا گیا، چنانچہ اس حوالے سے کلاسیکی دور کے فقہی ذخیرے کو غیر تنقیدی انداز میں پڑھانا ان فکری ونظری ابہامات کی جڑ کی حیثیت رکھتا ہے جن سے اس وقت موجودہ نظم ہائے ریاست کے خلاف پر تشدد رجحانات کے حق میں جواز اخذ کیا جا رہا ہے۔

جدید مغربی تہذیب کے زیر اثر مسلم اقوام کی معاشرت، قانون اور سیاست میں در آنے والے تغیرات کا منظر نامہ کچھ یوں بنتا ہے:

اسلامی تاریخ میں دنیا کے تمام مسلمانوں کے 'خلافت' کے عنوان سے ایک مرکزی سیاسی ادارے کے تحت منظّم

---

[31] ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضرات تعلیم، طبع دوم، ص ۶۶، ۶۷

ہونے کے تصور کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور مسلم سیاسی مفکرین اس سیاسی مرکزیت کو اسلام کے سیاسی نظام کی ایک مثالی شکل کے طور پر بیان کرتے رہے ہیں۔ یہ ادارہ بہت سی داخلی کمزوریوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ غیر موثر اور غیر مفید ہوتا چلا گیا اور آخری دور میں اس کی حیثیت بالکل علامتی رہ گئی۔ بالآخر ۱۹۲۴ء میں 'خلافت' کے ادارے کے بالکل ہی خاتمے کے بعد نیشنل ازم کے سیاسی تصور کے تحت مسلمان ممالک کی سیاسی پالیسیوں نے جو الگ الگ اور بسا اوقات باہم متصادم رخ اختیار کر لیا، وہ روایتی مذہبی ذہن کے لیے بے چینی اور اضطراب کا موجب ہے۔ اس تناظر میں خلافت کے ادارے کی داخلی کمزوریوں اور اس کے خاتمے کے اسباب کا معروضی تجزیہ کرنے کے بجائے اس کے اندھا دھند احیاء کو ہی مسلمانوں کی سیاسی مشکلات کا واحد تریاق قرار دیا جا رہا ہے۔

کلاسیکی دور میں دنیا کی غیر مسلم طاقتوں اور مسلم ریاستوں کے مابین تعلقات اور معاہدات اصلاً سیاسی مصلحت پر مبنی ہوتے تھے، جبکہ پوری دنیا کے لیے مشترک اور آفاقی اخلاقی یا قانونی ضابطوں کو معیار ماننے کا پہلو ان میں موجود نہیں تھا۔ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کی اساس یہ تھی کہ دنیا دارالاسلام اور دارالحرب کے دو حصوں میں تقسیم ہے اور مسلم و غیر مسلم ممالک کے مابین اصل اور مستقل تعلق 'جنگ' کا ہے، تا آنکہ غیر مسلم قومیں مسلم ریاست کا حصہ نہ بن جائیں یا ان کی بالادستی کو قبول کرتے ہوئے انھیں خراج ادا کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ دور جدید کا عالمی نظام، جس کے تحت اور جس کی پابندی کو قبول کرتے ہوئے جدید مسلم ریاستیں قائم ہوئی ہیں، اس کے بالکل برعکس ممالک اور ریاستوں کے باہمی تعلقات کے ضمن میں اصل 'امن' کو قرار دیتا اور باہمی تنازعات کو نمٹانے کے لیے جنگ کے طریقے کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اس صورت حال سے مذہبی ذہن کئی پہلوؤں سے اجنبیت محسوس کرتا ہے جن میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ کلاسیکی تصور کے مطابق دارالاسلام اور دارالحرب کی تقسیم کو 'جہاد' کے مذہبی حکم کی تائید بھی حاصل ہے جس کی رو سے اسلام کا غلبہ قائم کرنے کے لیے قوت و طاقت کا استعمال ایک مطلوب اور معیاری طریقہ ہے۔

موجودہ دور میں عالمی سطح پر غلبہ اسلام اور جہاد کے نام پر جو تحریکیں اٹھی ہیں، انہوں نے دراصل اسی استدلال کو بنیاد بنایا ہے۔ وہ موجودہ سرحدوں کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے، اس جغرافیائی تقسیم کو مسترد کرتیں اور مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے ایک وحدت قرار دیتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم ایک الگ امت ہیں۔ اس سے مسلم دنیا

میں پیدا ہونے والے فکری انتشار کے اثرات ظاہر و باہر ہیں۔

مسلم ریاست کے سیاسی ڈھانچے میں رونما ہونے والی بہت سی اہم تبدیلیاں بھی مذہبی ذہن کے لیے غیر مانوس ہیں۔ مثال کے طور پر حکمران کے انتخاب کو براہ راست عام لوگوں یا ان کے منتخب کردہ نمائندوں کے ووٹ پر مبنی قرار دینے کا طریقہ اسلامی تاریخ میں نہیں ملتا۔ اسی طرح کلاسیکی فقہ میں حاکم کے انتخاب کے لیے اہل حل وعقد کے مشورے کے ساتھ ساتھ ولی عہدی کو بھی ایک مستقل طریقے کے طور پر بیان کیا گیا ہے جبکہ بالجبر منصب اقتدار پر مسلط ہو جانے والوں کے حق حکمرانی کو بھی بالفعل تسلیم کیا گیا ہے۔ پھر حکومتی مناصب کے لیے اہلیت کے ضمن میں بہت سی شرائط عائد کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ 'خلیفہ' یعنی پوری ملت اسلامیہ کے سب سے اعلیٰ منصب حکمرانی کے لیے قبیلہ قریش کا فرد ہونا ضروری یا کسی نہ کسی درجے میں مطلوب ہے [32]۔ سیاسی، عدالتی اور انتظامی مناصب کے لیے خواتین کو بالعموم اہل نہیں سمجھا گیا۔ اسی طرح ایک مسلم ریاست کے غیر مسلم باشندوں کے لیے بھی ایسے مناصب پر تقرری کا استحقاق تسلیم نہیں کیا گیا [33]۔ دور جدید کی جمہوری مسلم ریاستوں میں بالعموم مذکورہ شرائط وضوابط کی پابندی قبول نہیں کی گئی اور ریاست کی سیاسی پالیسیوں، قانون سازی کے عمل اور قانون کی تعبیر وتشریح اور تنفیذ جیسے معاملات میں شرکت کو بلا لحاظ مذہب وجنس اصولی طور پر ریاست کے تمام باشندوں کا حق مانا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی جوہری تبدیلیوں کے ساتھ ریاستی نظام کا ناک نقشہ اس سے بالکل مختلف بن جاتا ہے جو کلاسیکی فقہ میں پڑھنے کو ملتا ہے۔

شریعت کے نفاذ میں یہ سوال بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ ریاست کی سطح پر اس کی کس تعبیر کو اختیار کیا جائے گا اور اس ضمن میں عملی طور پر فیصلہ کن اتھارٹی کس کے پاس ہوگی؟ معاصر مسلم ریاستوں میں سے سعودی عرب اور ایران میں بھی شرعی قانون کی تعبیر وتشریح کی حتمی اتھارٹی علماء ہی ہیں۔ تاہم دور جدید کی بیشتر مسلم ریاستوں میں اور خاص طور پر پاکستان میں قرآن وسنت کی قانونی تعبیر وتشریح کا حتمی اختیار کسی مخصوص طبقے کے بجائے منتخب جمہوری اداروں کے لیے تسلیم کیا گیا ہے، جبکہ قانون کی ترتیب وتدوین اور ان پر نظر ثانی کے لیے قائم کیے جانے والے قانونی اداروں، مثلاً

---

32 برصغیر میں جب تحریکِ خلافت برپا ہوئی تو بعض علما نے اس بنا پر اس کی مخالفت کی کہ عثمانی خلفا قریشی نہیں ہیں۔

33 مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، لاہور، اسلامک پبلیکیشنز

اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ میں بھی علما کے علاوہ دوسرے ماہرین قانون کو باقاعدہ شریک کیا گیا ہے۔ یہ صورت حال بھی مذہبی ذہن کے لیے عدم اطمینان اور تشویش کا باعث ہے۔

ان سوالات کے حوالے سے جہاں تک اعلیٰ سطحی مذہبی قیادت کا تعلق ہے تو کم سے کم پاکستان میں نفاذ اسلام کا بنیادی فریم ورک متعین کرنے میں اس نے کسی rigidity کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ پیش نظر صورت حال کے لحاظ سے نہایت اہم معاملات میں اجتہادی زاویہ نگاہ اختیار کیا اور نئے اجتہادی تجربات کو قبول کیا ہے۔ تاہم دینی مدارس میں نصاب کی سطح پر ان کی شعوری تفہیم اور اس کے عملی مضمرات اور تقاضوں سے طلبہ کو آگاہ کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدارس کے نظامِ تعلیم سے فیض یاب ہونے والے طلبہ معاشرہ، شریعت اور قانون کا وہی تصور ذہن میں رکھتے اور اسی کو نفاذ اسلام کی معیاری صورت تصور کرتے ہیں جو قدیم فقہی کتابوں میں درج ہے۔ اس تبدیلی کا کوئی شعوری فہم حاصل نہ ہونے کی وجہ سے یہ باقاعدہ سوچ پائی جاتی ہے جو دن بدن بڑھ رہی ہے کہ آیا جمہوری عمل کے ذریعے سے نفاذ اسلام ممکن بھی ہے یا نہیں اور یہ کہ مذہبی اکابر نے اگر کسی خوش فہمی کی بنا پر اس عمل میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تھا تو اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

اس تناظر میں دینی مدارس میں فکری تربیت پانے والے طلبہ واساتذہ کو کو فکری ابہام اور ذہنی الجھاؤ کی اس کیفیت سے باہر نکالنے کے لیے جامع نصابی اصلاحات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

جہاں تک اصول فقہ کا تعلق ہے تو اس علم کے گہرے اور عمیق تقابلی مطالعے کو نصاب سازی میں اہمیت نہیں دی گئی، حالانکہ اصول فقہ کے کلاسیکی دور میں جو نہایت اہم اصولی بحثیں فقہا اور اصولیین کی مرکز توجہ بنی رہیں اور جو مختلف اصولی مکاتب فکر کے قیام کا سبب بنیں، ان سے ان کے تاریخی تناظر میں روشناس کرانا بے حد اہم ہے۔ قرآن وسنت کا باہمی تعلق، خبر واحد کی حیثیت، استحسان، اجماع اور قیاس کا مقام، اہل مدینہ کا عمل وغیرہ، دراصل یہ وہ مباحث ہیں جو مختلف اصولی اور فقہی مکاتب فکر کو اصلاً ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔ ان مباحث کی توضیح کے بغیر علم اصول فقہ اور فقہ کی تاریخی وعلمی تناظر میں تفہیم ناممکن ہے۔ صرف اہل حدیث مدارس کے نصاب میں محمد عاصم الحداد کی کتاب ''اصول فقہ'' اور عبدالکریم زیدان کی ''الوجیز فی اصول الفقہ'' شامل کی گئی ہیں جن میں احناف کے علاوہ جمہور کے اصول استنباط

کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔تاہم یہ کتابیں بھی ان مباحث کے تفصیلی اور گہرے مطالعے کے لیے ناکافی ہیں۔

اسی طرح مقاصد شریعت جیسی اہم بحث اس نصاب سے بالکل غائب ہے، حالانکہ مقاصد کا فلسفہ ایک ہمہ گیر فلسفہ ہے اور اس کا اثر اصول فقہ کے کم وبیش تمام اہم مباحث پر پڑتا ہے۔مقاصد شریعت کے حوالے سے شرعی احکام کے ظاہری ڈھانچے کے ابدی یا وقتی ہونے کا جو نقطہ نظر معاصر اہل علم کی ایک بڑی تعداد پیش کر رہی ہے، وہ بجائے خود ایک بہت اہم اصولی بحث ہے اور اس میں مخالف نقطہ ہائے نظر کے تعارف کے ساتھ ساتھ ایک متوازن اور معتدل نقطے سے طلبہ کو متعارف کرانا بے حد ضروری ہے۔

مزید برآں اصول فقہ کی تدریس کے لیے جو کتب منتخب کی گئی ہیں، ان سے اس علم کے مباحث، ان کے تاریخی ارتقا اور بالخصوص اطلاقی علمی بحثوں کے ساتھ ان کے ربط وتعلق کا کوئی مرتب اور منضبط تصور طلبہ کو نہیں ملتا۔

معقولات (فلسفہ، منطق، کلام):

درس نظامی میں معقولات کے عنوان سے کم وبیش ہر شعبہ علم کے دائرے میں ایسی اعلیٰ سطحی کتابیں شامل کی گئی تھیں جن پر یونانی منطق کی اصطلاحات میں مباحث کی تنقیح کا رنگ کا غالب تھا۔اس ضمن میں یونانی فلسفہ، یونانی منطق اور علم الکلام کے علاوہ ریاضی اور ہیئت کے مضامین بطور خاص معقولات کا حصہ بنائے گئے تھے اور پورے نصاب پر معقولی رنگ بے حد غالب تھا۔تاہم نصاب میں مختلف مراحل پر ہونے والی تدریجی اصلاحات کے نتیجے میں موجودہ نصاب تعلیم میں یہ پہلو بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے اور منطق، فلسفہ اور کلام کے مضامین سے متعلق نصاب سکڑتا ہوا چند کتابوں تک محدود ہو گیا ہے۔

مثلاً ملا نظام الدین سہالوی کے مقرر کردہ درس نظامی میں علم منطق کی تدریس کے لیے منتہی درجات کی کتب مثلاً سلم العلوم، رسالہ میر زاہد اور ملا جلال کا انتخاب کیا گیا تھا۔بعد کے ادوار میں اس ضمن میں کافی اضافہ جات کیے گئے اور ابتدائی ومتوسط درجات کے لیے مختصر اور متوسط کتب ورسائل بھی شامل کیے گئے، مثلاً ایساغوجی، مرقاۃ، شرح تہذیب ،القطبی۔موجودہ نصاب میں اس فن کی تعلیم کا آغاز ایک مختصر رسالہ ''المنطق'' اور مولانا مشتاق احمد چرتھاولی کے رسالہ ''تیسیر المنطق'' سے کیا جاتا ہے۔اس کے بعد ایساغوجی، مرقاۃ اور شرح تہذیب پڑھائی جاتی ہیں جبکہ آخری کتاب

القطبی ہے جس کا ایک منتخب حصہ شامل نصاب ہے۔ سلم العلوم اور میر زاہد وغیرہ کتب جو اس نصاب کا امتیازی حصہ تصور کی جاتی تھیں، بتدریج نصاب سے خارج کر دی گئی ہیں۔

اسی طرح قدیم فلسفہ کے ضمن میں درس نظامی میں ہدایۃ الحکمۃ، میبذی، الشّمس البازغہ اور ملا صدرا وغیرہ کا انتخاب کیا گیا تھا، جبکہ موجودہ نصاب میں ان تمام کتابوں کو تدریجاً خارج کر کے صرف ایک کتاب ''معین الفلسفہ'' (مصنفہ مولانا سعید احمد پالن پوری) پر اکتفا کر لی گئی ہے۔

عقائد وعلم الکلام کے مضمون کے تحت درس نظامی میں شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد اور شرح مواقف شامل کی گئی تھیں۔ بعد ازاں اس فہرست میں ''خیالی علیٰ شرح العقائد'' کا بھی اضافہ کیا گیا۔

وفاق المدارس العربیہ کے موجودہ نصاب میں مذکورہ فہرست میں سے صرف ایک کتاب یعنی شرح عقائد تفتازانی شامل ہے، جبکہ اس کے ساتھ العقیدۃ الطحاویۃ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح کچھ عرصہ قبل ''الانتباھات المفیدۃ فی حل الاشکالات الجدیدۃ'' کا عربی ترجمہ بھی شامل نصاب کیا گیا ہے جس کا بنیادی موضوع برصغیر میں سرسید کے مکتب فکر کی پیش کردہ دینی تعبیرات کی تردید ہے۔ اسی طرح چند سال قبل قادیانیت کے موضوع پر ''آئینہ قادیانیت'' کو نصابی کتاب کے طور پر شامل کیا گیا ہے، جبکہ حال ہی میں دیوبندی فکر ومزاج کی تفہیم کے لیے مولانا قاری محمد طیب کی تصنیف ''علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج'' کو بھی نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

دیگر وفاقوں میں سے وفاق المدارس السّلفیہ کے نصاب میں شرح عقائد نسفی کے بجائے شرح العقیدۃ الواسطیۃ اور کتاب التوحید از شیخ محمد بن عبدالوہاب شامل کی گئی ہیں، جبکہ تنظیم المدارس کے نصاب میں مفتی عبدالقیوم ہزاروی کی ''العقائد والمسائل'' کو جزو نصاب بنایا گیا ہے۔ رابطۃ المدارس کے نصاب میں بعض جدید اعتقادی وکلامی مباحث پر بھی توجہ کی گئی ہے اور ختم نبوت کے موضوع پر مولانا مفتی محمد شفیع اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف جبکہ جماعت اسلامی کے مخصوص تصورِ دین کے حوالے سے مولانا مودودی کی ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' اور مولانا صدر الدین اصلاحی کی ''فریضہ اقامت دین'' شامل نصاب ہیں۔

برصغیر میں اکبری عہد میں ملا فتح اللہ شیرازی کے زیر اثر معقولات کی تعلیم کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس میں فلسفہ

کے مباحث کی تعلیم وسیع تر تناظر میں دیے جانے کے بجائے ان چند مخصوص کتابوں مثلاً ہدایۃ الحکمۃ، میبذی، الشمس البازغہ اور ملا صدرا وغیرہ کا انتخاب کیا گیا جو اس دور میں مختلف وجوہ سے ایرانی درس گاہوں میں زیادہ مقبول تھیں۔ ملا قطب الدین اور ملا نظام الدین نے ''درس نظامی'' مرتب کیا تو اس میں بھی انھی کتابوں کا انتخاب کیا گیا اور بعد کے ادوار میں بھی فلسفہ کی تدریس کے لیے عموماً اسی نصاب پر انحصار کیا گیا۔ ان کتابوں کے مضامین یونانی فلسفے کے ان مباحث کے گرد گھومتے ہیں جن سے عباسی دور میں یونانی علوم کے عربی زبان میں ترجمہ کی وساطت سے مسلمان واقف ہوئے۔ ان چند مخصوص کتابوں پر انحصار اور فلسفے کی بنیادی ماہیت اور اس کی عمومی تاریخ سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ کے ذہنوں میں عموماً فلسفہ کا جو تصور پایا جاتا ہے، وہ کچھ یوں ہے کہ فلاسفہ یا حکماء نام کی کوئی ایک جماعت ہے جس کے کچھ مخصوص ومتعین نظریات ہیں جو ان کے ہاں عقائد کا درجہ رکھتے ہیں اور ان نظریات کو 'فلسفہ' کہا جاتا ہے۔

فلسفہ کا یہ تصور، ظاہر ہے کہ بے حد ناقص ہے، کیونکہ فلسفہ چند متعین اور طے شدہ نظریات کا نہیں، بلکہ عقلی بنیادوں پر غور وفکر کی ایک مسلسل روایت کا نام ہے جس میں بے شمار مختلف ومتنوع بلکہ متضاد رجحانات ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ خود مسلمانوں کی فکری روایت اس تنوع اور تغیر وارتقا کی ایک رنگا رنگ داستان ہے۔ عرب ابتداءً یقیناً اس طرح کی عقلی بحثوں سے یونانی علوم کے ترجمہ کی وساطت سے واقف ہوئے تھے، لیکن اس کے بعد ان تصورات ونظریات کی تنقیح، تشریح وتوضیح اور تردید واثبات کی ایک مستقل علمی روایت قائم ہوگئی جس میں اگر ایک طرف یونانی فلسفے کے ان تصورات کو اسلامی عقائد کے مطابق ڈھالنے اور انھیں اسلامی عقائد کی عقلی تفہیم کے لیے استعمال کرنے کا رجحان سامنے آیا تو دوسری طرف اس کے برعکس فلسفہ یونان کے اساسی تصورات پر نقد ومحاکمہ کا فکری رجحان بھی پیدا ہوا۔ چنانچہ دور متوسط میں غزالی اور بعد ازاں ابن تیمیہ وغیرہ نے یونانی منطق وفلسفہ پر جان دار تنقیدیں کیں اور ان عقلی معیارات کو چیلنج کیا جن کی بنیاد پر فلاسفہ کے خلاف اسلام نظریات کی تائید کی کوشش کی جارہی تھی۔ یونانیوں سے ورثے میں ملنے والے تصورات ومباحث کے علاوہ مسلمانوں میں ایسے جلیل القدر اہل فکر بھی پیدا ہوئے جنھوں نے نئے اور طبع زاد مباحث پر دادِ فکر دی اور مابعد الطبیعیات کے علاوہ انسانی نفسیات، علم اخلاق، عمرانیات، سیاسیات اور فلسفہ تاریخ جیسے موضوعات پر اپنے نتائج فکر پیش کیے۔ ان میں الکندی، الفارابی، ابن سینا، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، ابن خلدون اور نصیر الدین

طوسی وغیرہ کے نام نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ عقل اور شریعت کے باہمی تعلق جیسے دقیق سوالات پر علم کلام اور اصول فقہ میں معرکہ آرا بحثیں اٹھائی گئیں اور اس حوالے سے مختلف فکری رجحانات معتزلہ، اشاعرہ اور ماتریدیہ وغیرہ مکاتب فکر کی صورت میں مجسم ہو کر سامنے آئے۔ مسلم صوفیہ نے اہم ترین فلسفیانہ مباحث کے حوالے سے ایک مستقل روایت کی بنیاد ڈالی جس کا بنیادی ماخذ کشف وعرفان اور روحانی سیر ومشاہدہ تھے۔

اس تناظر میں فلسفہ کی تعلیم کے حوالے سے دینی تعلیم کے نصاب پر ایک بنیادی اور اساسی نوعیت کی نظر ثانی کی ضرورت ہے جس کی طرف کافی عرصے سے بالغ نظر اہل علم توجہ دلاتے چلے آ رہے ہیں، لیکن ان کی آواز ہنوز صدا بصحرا ہی محسوس ہوتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے فلسفہ کے اس جامد تصور پر ان الفاظ میں تنقید کی کہ:

> ''اب وقت آ گیا ہے کہ جہاں تک معقولات کا تعلق ہے، آپ اس حقیقت پر غور کریں کہ معقولات کا جو کچھ ذخیرہ ہے، وہ سب بیکار ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ فلسفہ اور تاریخ میں ایک عہد متوسط ہے۔ یہ درمیانی عہد حقیقتاً ایک کڑی ہے جو یونانی فلسفے کو موجودہ زمانے کے فلسفے سے قریب کرتی ہے اور یہ کڑی دراصل عربوں کا فلسفہ ہے۔ زمانے کو اس کی ضرورت ہے کہ کوئی ایک کتاب تو ایسی ہو کہ جس سے اہل علم کو معلوم ہو سکے کہ فلسفہ عربوں نے جو یونانیوں سے لیا، اس کو انھوں نے کس طریقہ سے محفوظ رکھا اور آنے والی نسلوں تک پہنچایا۔ نیز اس کے مباحث میں انھوں نے کتنے نئے قدم اٹھائے۔ بلاشبہہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعہ سے ہم اس چیز کو محفوظ رکھ سکیں۔

آج جو طریقہ ہے فلسفہ کا، مثلاً انھوں نے گریک فلسفہ کو لیا، یونانی فلسفہ کو لیا۔ اس کے خاص مسائل پر روشنی ڈالی۔ بیچ کا جو دور آیا، اس کی کہانی سنائی۔ اس کے بعد ماڈرن زمانہ آیا جسے عہد حاضر کہتے ہیں۔ اب یہ دماغ اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے آگے جو ایک تصویر آ جاتی ہے، فلسفہ کے مختلف عہدوں کی، مختلف دوروں کی، وہ اس کے لیے کفایت کرتا ہے کہ دماغ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اب ہمیں کوئی نہ کوئی چیز اس طریقے کی رکھنا ہے کہ جو قدیم

ذخیرہ موجود ہے، اس کو ہم پورے طور پر محفوظ رکھ سکیں اور نمایاں رکھیں کہ ایک طالب علم جو ہمارے مدرسے میں آیا ہے، وہ اس سے بے خبر نہ رہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے ضرورت ہے کہ یہ حقیقت مان لی جائے کہ دراصل جو فلسفہ آپ کو پڑھانا ہے، وہ مختلف مسائل ہیں جو کہ اس وقت منقح ہو چکے ہیں۔ اگر یہ چیز آپ نہیں کرتے تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ زمانہ سے واقف نہیں ہیں، بلکہ آپ زمانے سے لڑ رہے ہیں[34]۔

یہی معاملہ علم الکلام کا ہے۔ علم الکلام کے دائرے میں جو مواد درس نظامی میں شامل کیا گیا تھا اور جواب محض جزوی طور پر باقی ہے، اس کا مافیہ بحث ومباحثہ کے وہ موضوعات تھے جن کا آغاز اس وقت ہوا جب اسلام کا دائرہ مختلف جہات میں پھیلنے کے ساتھ ساتھ ایرانی، یونانی، قبطی اور ہندی فلسفوں سے مسلمانوں کا تعارف شروع ہوا اور ان فلسفوں کے حوالے سے پیدا ہونے والے شکوک وسوالات نے مسلمان علماء کو جوابی علم الکلام مرتب کرنے کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔ اس حوالے سے بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبہ کو علم الکلام کے آغاز وارتقا، کلامی مباحث کا تاریخی پس منظر اور مختلف کلامی مکاتب فکر کی فکری بنیادوں سے روشناس کرایا جائے جبکہ موجودہ نصاب میں اس اہم ترین ضرورت سے بالکل صرف نظر کر لیا گیا ہے۔

دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ علم الکلام کے دائرے میں صرف وہ مباحث شامل نہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے داخلی مذہبی اختلافات سے ہے۔ مسلمانوں کو ہر دور میں اسلام کے بنیادی عقائد وتصورات کے حوالے سے ملحدین اور منکرین مذہب کے مختلف گروہوں سے واسطہ رہا ہے اور ان کی طرح سے اسلامی عقائد اور شرعی احکام کے بارے میں طرح طرح کے اعتراضات اٹھائے جاتے رہے ہیں۔ اسی طرح دیگر مذہبی گروہوں مثلاً اہل کتاب کے ساتھ مذہبی بحث ومباحثہ بھی کم وبیش ہر دور میں جاری رہا ہے۔ اسلامی روایت میں ان تمام مباحث کے حوالے سے گراں قدر علمی ذخیرہ موجود ہے، لیکن موجودہ نصاب میں ان سے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی گئی۔

علم الکلام کی تدریس کے حوالے سے موجودہ نصاب کی تیسری بڑی خامی یہ ہے کہ یہ عصر حاضر کے اعتقادی وکلامی مباحث سے سرے سے تعرض ہی نہیں کرتا۔ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا زاہد الراشدی لکھتے ہیں:

---

[34] خطبات آزاد، مرتبہ مالک رام، ص ۳۶۲، ۳۲۸

''علم الکلام، جو ہمارے دینی نصاب کا باقاعدہ حصہ ہے، اب تک انھی خطوط پر استوار ہے جن پر صدیوں قبل اس کی تشکیل ہوئی تھی۔ اب ہم ان تبدیلیوں اور ان کے حوالے سے پیدا ہونے والی ضروریات کی طرف آتے ہیں جو گزشتہ تین صدیوں کے دوران بتدریج رونما ہوئی ہیں اور ہمارے خیال میں ہم اپنے تنزل اور غلامی کے اس دور میں ''تحفظات'' کے دائرے میں محصور ہو جانے کی وجہ سے ان کی طرف توجہ نہیں دے سکے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ''علم العقائد والکلام'' ان تبدیلیوں اور ضروریات کو اپنے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر سکا اور ہم آج کے عالمی تناظر میں ایمانیات وعقائد کے ضروری تقاضوں کے ساتھ اس کو ہم آہنگ نہیں پاتے جس کی طرف مختلف اصحاب فکر ودانش ہمیں وقتاً فوقتاً توجہ دلاتے رہتے ہیں، لیکن ہم ابھی تک اس کا پوری طرح احساس وادراک نہیں کر پا رہے۔

بطور نمونہ عقائد وایمانیات سے تعلق رکھنے والے چند سوالات کا ذکر کرنا چاہوں گا جو آج کے علمی تناظر میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنوں میں ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں اور ان کے قابل اطمینان جوابات فراہم کرنا ہماری اسی طرح کی ذمہ داری ہے جس طرح ابوالحسن اشعری اور ابومنصور ماتریدی نے اپنے دور کے علمی چیلنج کا منطق واستدلال کے ساتھ سامنا کیا تھا:

- انسان کو جب نفع ونقصان کے ادراک کے لیے عقل دی گئی ہے تو پھر مذہب کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے؟
- وحی کی ماہیت کیا ہے اور کیا یہ انسانی عقل ووجدان سے ہٹ کر کوئی الگ چیز ہے؟
- وحی اور عقل کا باہمی تعلق کیا ہے؟
- انسانی سوسائٹی جب مسلسل ارتقا کی طرف بڑھ رہی ہے تو نبوت کا دروازہ درمیان میں کیوں بند ہو گیا ہے؟
- سائنس اور مذہب کا باہمی جوڑ کیا ہے؟
- مذاہب کی مشترکہ صداقتوں پر یکساں ایمان رکھنے اور ان کے مشترکہ مصالح پر مشتمل احکام پر عمل کرنے میں کیا

حرج ہے اور کسی ایک مذہب کی پابندی کیوں ضروری ہے؟

- سوسائٹی کے ارتقاء اور تجربات کی بنیاد پر تشکیل پانے والے افکار ونظریات اور تہذیب کو مسترد کرنے کا کیا جواز ہے؟
- قرآن وسنت کے معاشرتی احکام اس دور کی عرب ثقافت یا رواجات کے پس منظر میں تھے یا اس سے مختلف
- ثقافتوں کے ماحول میں بھی واجب العمل ہیں؟
- احکام وقوانین میں مصالح ومنافع اور اہداف ومقاصد معتبر ہیں یا ظاہری ڈھانچہ بھی ضروری ہے؟
- اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا کا وجود بھی ہے یا نہیں؟ وغیر ذلک۔

یہ مسائل نئے نہیں ہیں، بلکہ ہر دور میں کسی نہ کسی عنوان سے زیر بحث رہے ہیں، لیکن آج کے عالمی تناظر میں یہ زیادہ ابھر کر سامنے آئے ہیں اور ایک مسلمان کو اسلامی اعتقادات وایمانیات کے معیار پر باقی رکھنے کے لیے ان سوالات اور ان جیسے دیگر بہت سے سوالات کے ایسے جوابات ضروری ہیں جو آج کے علمی تناظر اور ہمہ نوع معلومات کے افق میں قابل اطمینان ہوں[35]۔

مابعد الطبیعیاتی تصورات سے لے کر اسلامی شریعت کے احکام اور قرآن وحدیث اور ذخیرہ سیرت کے تاریخی استناد تک مختلف دائروں سے متعلق ایسے مسائل کی ایک طویل فہرست ہے جو دور جدید میں منکرین مذہب کی طرف سے بطور اعتراض اٹھائے جاتے ہیں اور جن کا سامنا کرنا آج کے علم الکلام کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ تاہم موجودہ نصاب میں اس ضرورت کی تکمیل کی طرف برائے نام بھی توجہ نہیں دی گئی۔

عربی زبان وادب

عربی زبان وادب کی تدریس کے حوالے سے کلاسیکی درسِ نظامی کے مندرجات پر برصغیر میں بیسویں صدی کے آغاز سے ہی تنقید کا آغاز ہو چکا تھا اور غالباً جس مضمون کی تدریس پر گزشتہ صدی میں مختلف پہلوؤں سے سب سے زیادہ تنقید کی گئی ہے، وہ عربی زبان وادب ہی کا مضمون ہے۔ اس ضمن میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں سب سے زیادہ

[35] الشریعہ، اپریل ۲۰۱۳، ۶-۲

اجتہادی طرزِ فکر اختیار کیا اور تدریس کے لیے نامور عرب اساتذہ کو اپنے ہاں دعوت دے کر ان کے نظریات و تجربات سے کشادہ دلی کے ساتھ استفادہ کیا۔ ندوہ کے اہل قلم نے اس حوالے سے برصغیر میں زبان و ادب کی تدریس کے بنیادی تصور اور منہج پر کڑی تنقید کی اور منطقی و تجربی استدلال کے ذریعے سے اس میں اصلاح کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس ضمن میں اپنی تحریروں میں جا بجا درج ذیل نکات کو بالتفصیل واضح کیا ہے:

> ''(علامہ تقی الدین ہلالی) کی صحبت و افادات سے دو حقیقتیں پہلی بار منکشف ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ زبان اور ادب میں فرق ہے۔ زبان وہ ہے جو ادب کی بنیاد ہے۔ ادب زبان کی بنیاد کے کاخ و ایوان اور زبان کی دیوار کے نقش و نگار ہیں۔ ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے جو تمدن و تخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے۔ زبان کی تعلیم و تربیت ادب کی تعلیم پر مقدم ہے۔ اگر زبان نہیں آتی تو ادب نہیں آ سکتا اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے۔ ہندوستان میں زبان کے دھوکہ میں اور عربی زبان کے نام سے اعلیٰ عربی ادب کی تعلیم دی جا رہی ہے جو اکثر اوقات بے بنیاد اور بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے''۔

ہلالی صاحبؒ کہتے تھے کہ ''حریری'' اور ''متنبّی'' و ''حماسہ'' ادب عربی کی اعلیٰ کتابیں ہیں جو بلاد عربیہ میں زبان کی طویل اور مسلسل تعلیم اور زبان کی مشق کے بعد پڑھائی جاتی ہیں اور عربی ادب کی تکمیل کرنے والے فضلاء ان کو پڑھتے ہیں، لیکن ہندوستان میں یہی کتاب ادب کا کل سرمایہ اور جمع خرچ ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان سے پہلے زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھا جائے۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ زبان کو انسانی زبان کی طرح بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھنا چاہیے۔

(دوسری حقیقت یہ منکشف ہوئی) کہ صرف و نحو کے قواعد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں جن کا درجہ زبان کے بعد ہے۔ زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہ ہو تو صرف و نحو کے قواعد بے کار ہیں۔ مفردات، الفاظ و جمل مکان کی اینٹیں ہیں اور نحو کا علم اصول تعمیر کے قواعد اور انجینئری کا فن۔ اگر سرے سے اینٹیں نہ ہوں تو انجینئرنگ اور اصول تعمیر کا بڑے سے بڑا علم

ناکارہ اور فضول ہے[36]''۔

اسی حوالے سے تنقید کا ایک پہلو یہ تھا کہ یہ نصاب اور خاص طور پر طرز تدریس سالہا سال کی مشق اور مہارت کے باوجود طلبہ میں اظہار مافی الضمیر اور تحریر وانشا کی صلاحیت پیدا نہیں کرتا۔ ماضی قریب میں عربی زبان کے نامور ادیب، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس صورتحال کا شکوہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''یہ ایک بڑی تعجب خیز اور ناقابل فہم بات ہے کہ کوئی فرد یا جماعت اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ اور اپنی ذہنی صلاحیتیں ان علوم وتصنیفات کے درس ومطالعہ میں صرف کرے جو عربی زبان میں لکھی گئی ہیں، لیکن اس زبان میں اظہار خیال سے بالکل معذور وقاصر ہو۔ زبانوں کے سلسلے کا یہ بالکل انوکھا تجربہ ہے جو صرف ہندوستان کے عربی مدارس اور علمی مجالس کی خصوصیت ہے۔

اس معذوری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کو جس کی بدولت ہم اسلام سے علمی تعلق پیدا کرتے ہیں، کبھی زبان کی حیثیت سے پڑھنے پڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کو بھی ایک نظری علم اور ایک کتابی فن کی حیثیت سے دیکھا گیا اور صرف کتابوں کے سمجھنے کا ذریعہ سمجھا گیا۔ اس ذہنیت اور نقطہ نظر کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی اس کی عملی مشق اور تحریر وانشاء کی طرف توجہ نہیں دی گئی اور اس کا انجام یہ ہے کہ ہمارے بہت سے فضلاء مدارس اپنی دوسری صلاحیتوں کے ساتھ عربی زبان میں چند سطریں لکھ لینے یا چند منٹ گفتگو کر لینے پر قادر نہیں ہیں، خصوصاً جبکہ یہ تحریر یا گفتگو عام زندگی یا روزمرہ کی ضرورت سے متعلق ہو اور خالص دینی یا علمی بحث میں محدود نہ ہو۔ یہ کمی اہل نظر کو پہلے بھی محسوس ہوتی تھی، لیکن اب جب کہ عربی ممالک کے فضلاء سے اختلاط اور اجتماع کے زیادہ مواقع پیدا ہو گئے ہیں اور دینی خدمت کا میدان زیادہ وسیع ہو گیا ہے، یہ کمی زیادہ شدت سے محسوس کی جانے لگی ہے[37]۔

تنقید کا ایک اہم نکتہ یہ بھی تھا کہ اس نصاب میں عربی ادب کے جو نمونے تدریس کے لیے منتخب کیے گئے ہیں،

---

[36] علماء دیوبند کی علمی ومطالعاتی زندگی، مرتبہ مولانا عبدالقیوم حقانی، ص ۸۵، ۹۵

[37] مقدمہ معلم الانشاء حصہ اول، ص ۸، ۹

وہ حقیقی معنوں میں ''ادب'' کے نہیں، بلکہ لفظی صناعی کے اسلوب کے نمونے ہیں جو ایک خاص دور میں بعض وجوہ سے زیادہ مقبول ہو گیا تھا۔ سید ابوالحسن علی ندوی نے ''مختارات من ادب العرب'' کے مقدمے میں اسی صورتحال کی شکایت یوں کی کہ:

> ''اس کے بعد عجم کے اسلوب کی تقلید کرنے اور پر تکلف اسلوب میں لکھنے والوں کا دور آیا اور بلاد عربیہ میں ابو اسحاق صابی، ابو الفضل بن العمید، صاحب بن عباد، ابو بکر الخوارزمی، بدیع الزمان ہمذانی اور ابو العلاء المعری جیسوں نے کمال پیدا کیا۔ انھوں نے تحریر وانشاء کا ایک اسلوب ایجاد کیا جو عربی کے رواں اسلوب بیان اور متقدمین اہل عرب کے بے تکلف اور طبیعت انسانی کے ساتھ ہم آہنگ اسلوب سے زیادہ دست کاری اور نقش ونگار بنانے سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا۔ ان پر سجع بندی اور بدیع کا اسلوب غالب آ گیا اور وہ اس میں اس قدر غلو کا شکار ہو گئے کہ زبان کی رونق اور روانی ختم ہو گئی اور ادب کو ایسی بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑ دیا گیا جس نے اسے اس کی آزادی اور بہاو اور روح کے ہلکے پن اور جمال سے محروم کر دیا[38]''۔

مذکورہ تنقیدات کی روشنی میں گزشتہ پون صدی میں عربی زبان وادب کی تعلیم کے نصاب میں سست رفتاری کے ساتھ اصلاحات کا ایک عمل جاری نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے موجودہ نصاب کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں عربی زبان وادب کی تعلیم کے درج ذیل مختلف پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی گئی ہے:

ا۔ عربی صرف ونحو کے قواعد:

وفاق المدارس العربیہ کے نصاب میں اس حصے کی تدریس کا آغاز عربی بول چال کی ابتدائی مشق اور بنیادی قواعد پر مبنی درسی کتاب ''الطریقۃ العصریہ'' اور اس کے ساتھ ساتھ عربی، اردو اور فارسی میں لکھے گئے بعض مختصر رسائل (علم صرف میں 'میزان الصرف' اور 'منشعب' وغیرہ اور علم نحو میں 'نحو میر' اور 'شرح مائۃ عامل') سے ہوتا ہے۔ اگلے مرحلے پر

---

38 ص ۴۱

بعض متوسط کتب (علم صرف میں علم الصرف/ ارشاد الصرف اور علم الصیغۃ جبکہ علم نحو میں ھدایۃ النحو اور الکافیۃ) کی تعلیم دی جاتی ہے جس کے ساتھ قواعد کی تمرین کے لیے بعض کتب (علم صرف میں صفوۃ المصادر، اور تیسیر الابواب اور علم نحو میں المنھاج فی القواعد والاعراب یا النحو الیسیر اور تسہیل النحو وغیرہ) شامل کی گئی ہیں، جبکہ نصاب کے نقطہ کمال کے طور پر کافیہ پر ملا جامی کی تصنیف کردہ شرح کے منتخب حصے (از مرفوعات تا مبنیات) شامل کیے گئے ہیں۔

۲۔ نثری ومنظوم ادب:

اس حصے کی ابتدا بعض مختصر ریڈرز (زاد الطالبین اور القراۃ الراشدۃ) سے کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اگلے درجات میں نثری ادب کے ضمن میں نفحۃ العرب اور مقامات الحریری کی جبکہ منظوم ادب کے ذیل میں دیوان المتنبی، السبع المعلقات اور دیوان الحماسۃ کے منتخب حصوں کی تدریس کی جاتی ہے۔

تعلیم زبان کے مذکورہ دونوں حوالوں سے دیگر وفاقوں کے نصاب میں بعض اہم تبدیلیاں ملتی ہیں۔ مثلاً وفاق المدارس السّلفیہ کے نصاب میں صرف ونحو کی ابتدائی تمرین کے لیے آسان عربی (مصنفہ مولانا محمد بشیر)، تمرین الصرف اور تمرین النحو جبکہ عربی ریڈر کے طور پر اقرا (مصنفہ مولانا محمد بشیر) شامل کی گئی ہے۔ متوسط درجات میں عربی بول چال اور قواعد کی مشق کے لیے ف عبد الرحیم کی دروس اللغۃ العربیۃ جزوِ نصاب ہے، جبکہ اعلیٰ درجات میں عربی نحو کی تدریس کے لیے شرح ابن عقیل کا انتخاب کیا گیا ہے۔ عربی ادب کا نصاب بھی نمایاں طور پر زیادہ پر ثروت ہے، چنانچہ کلیلۃ ودمنۃ کے علاوہ دیوان المبرد اور العبرات بھی شامل نصاب ہیں۔ رابطۃ المدارس کے نصاب میں ابتدائی بول چال کی تمرین کے لیے الطریقۃ العصریۃ کے بجائے الطریقۃ الجدیدۃ (محمد امین مصری) کا انتخاب کیا گیا ہے، جبکہ قواعد صرف ونحو کی تفصیلی تمرین پر مبنی کتاب 'النحو الواضح' (مصنفہ علی الجارم) اور عربی ریڈر کے طور پر قصص النبیین (ابوالحسن علی ندوی) اور القراۃ الرشیدۃ (عمر علی بک) بھی شامل کی گئی ہیں۔ اسی طرح عربی ادب کے نصاب میں سید ابوالحسن علی ندوی کی مختارات من ادب العرب کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ تنظیم المدارس کے نصاب میں منظوم ادب میں امام بوصیری کا قصیدہ بردہ بھی شامل ہے۔

۳۔ عربی تحریر وانشاء کی مشق:

اس مقصد کے لیے وفاق المدارس العربیہ اور رابطۃ المدارس کے نصاب میں ندوۃ العلماء کے بعض اساتذہ کی

مرتب کردہ ''معلم الانشا'' شامل کی گئی ہے، جبکہ اہل حدیث مدارس میں اس مقصد کے لیے مولانا محمد بشیر کی مفتاح الانشاء کا انتخاب کیا گیا ہے۔

۴۔ **علم بلاغت کے اصول وقواعد:**

وفاق المدارس العربیہ کے موجودہ نصاب میں علم بلاغت کی تدریس کے لیے بنیادی درسی کتاب دروس البلاغۃ ہے جبکہ اس کے بعد کلاسیکی متون میں سے تلخیص المفتاح کی شرح مختصر المعانی کے منتخب اجزا پڑھائے جاتے ہیں۔

۵۔ **علم عروض وقوافی:**

اس فن میں ایک ہی رسالہ 'متن الکافی' شامل نصاب کیا گیا ہے۔

مذکورہ پہلوؤں کے علاوہ صرف تنظیم المدارس کے نصاب میں عربی ادب کی تاریخ پر بھی ایک کتاب شامل نصاب نصاب کی گئی ہے جو ایک منفرد مثال ہے۔

اس مختصر جائزے سے واضح ہے کہ نصاب کی اصلاح کے حوالے سے کی جانے والی بنیادی تنقیدات کافی حد تک موثر ہوئی ہیں اور نصاب کی تشکیل میں زبان کی تدریس کے جدید تصورات ومناہج کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ البتہ بعض اہم اور بنیادی خامیاں ہنوز برقرار ہیں اور ان کی اصلاح کے لیے وقتاً فوقتاً آوازیں بھی اٹھتی رہتی ہیں۔

نصاب کی سب سے بنیادی خامی کا تعلق قواعد زبان کی تدریس سے متعلق ہے اور اس کے دو پہلو بے حد نمایاں ہیں:

ایک یہ کہ اس میں قواعد زبان کی عملی مشق کے بجائے ساری توجہ قواعد کی نظری وتصوراتی تفہیم اور قواعد کے انطباق کی منطقی شرائط وقیود کی تنقیح پر مرکوز کی گئی ہے۔ بالخصوص اعلیٰ سطحی نصابی کتب مثلاً شرح جامی وغیرہ میں جن بحثوں پر زور بیاں صرف کیا گیا ہے، وہ قواعد سے زیادہ فلسفہ قواعد کے زمرے میں آتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان کتابوں میں تعلیم قواعد کے لیے تدریج (gradation) کا فطری طریقہ اختیار نہیں کیا گیا، یعنی عربی زبان کی تعلیم کے ممتاز ماہر ومتخصص مولانا محمد بشیر سیالکوٹی نے ان دونوں پہلوؤں سے موجودہ نصاب کے نقائص کو تفصیلاً واضح کیا ہے۔ ذیل میں ان کے تجزیے کے منتخب حصے نقل کیے جاتے ہیں:

''کمسن بچوں کی تعلیم وتربیت کی نصاب سازی میں تدریج کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے

کہ بچوں کو پہلے آسان اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تعلیم دی جائے اور پھر اسے ان کی ذہنی سطح اور معیار کے مطابق درجہ بدرجہ ترقی دی جائے۔ اس وقت مدارس کے پہلے تعلیمی مرحلے میں مروجہ نحوی کتابوں کے مواد کا بڑا حصہ (تقریباً اسی فیصد) بچوں کے لیے نامناسب ہے''۔(ص۲۵۳)

اسلامی مدارس کے پہلے تعلیمی سال میں داخل ہونے والے چھوٹے بچوں کو علم نحو وعلم صرف کی ایسی جامع کتابوں کی تدریس شروع کرادی جاتی ہے جن میں تمام مباحث اور مسائل کی جزئیات مذکور ہونے کی بنا پر بچوں کے لیے نہایت مشکل اور پیچیدہ خیال کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم ان کے ہاتھوں میں ابواب الصرف، ارشادالصرف اور علم النحو، العوامل المائۃ (شرح مائۃ عامل) باترکیب جیسی خالص فنی کتابیں دیکھتے ہیں جن میں

۱۔ ان علوم کے تمام مباحث اور مضامین درج ہیں، ان کا اسلوب بیان علمی اور فنی ہے، ایسی اصطلاحات مذکور ہیں جنھیں کمسن بچے سمجھ نہیں سکتے۔

۲۔ ان کے مضامین کے انتخاب میں بھی انھیں کمسن بچوں کی عمر اور سطح کے مطابق نہیں رکھا گیا اور

۳۔ نہ ان کے مباحث اور مضامین کے اندراج، ترتیب اور تقدیم وتاخیر میں کمسن بچوں کے لیے مناسب یا نا مناسب ہونے کو ملحوظ رکھا گیا، بلکہ ان مشکل اور پیچیدہ مضامین کی ترتیب وہی ہوتی ہے جو بڑے تعلیمی مراحل کے طلبہ کے لیے ہوتی ہے۔''(ص۴۰۴، ۵۰۴)

''ہماری درس گاہوں میں عربی زبان کی درسی کتابوں میں عملی استعمالات کی تمرینات موجود ہیں اور نہ معلم ایسی مشق کراتا ہے۔ ہم پہلے سال ہی پورے علم الصرف کی کئی فنی کتابیں پڑھاتے ہیں اور رٹواتے ہیں جن میں فن کے تمام مسائل مذکور ہوتے ہیں۔ ہم تین چار سال تک علم الصرف کی غیر عملی کتابیں رٹواتے رہتے ہیں جن میں زندہ عربی زبان کو پڑھنے، بولنے اور لکھنے کی تمرینات موجود نہیں ہوتیں۔ ہم پہلے سال ہی پورے علم النحو کی فنی کتاب کی تعلیم دیتے ہیں، بلکہ دو تین کتابیں پڑھاتے ہیں۔ ہم نحو کی سات آٹھ ایسی کتابیں پڑھاتے ہیں جن میں عملی تمرینات موجود نہیں ہوتیں اور ان کی تدریس تین چار سال جاری رہتی ہے۔''(''درس نظامی کی اصلاح اور ترقی''، ص۲۸۱، ۷۸۱)

''نحو وصرف کی نصابی کتابیں اور طریقہ تدریس دونوں عربی زبان کو مناسب طریقے پر نہیں سکھاتے، بلکہ پڑھنے والے بچوں اور طلبہ کو اس سے دور کرتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ انھیں سینکڑوں قاعدوں اور گردانوں کو رٹواتے رہتے ہیں، وہ ان قاعدوں اور گردانوں کے رٹنے میں رات دن اور صبح شام لگے رہتے ہیں۔ گرامر کی تفصیلات کے رٹنے کا یہ سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے۔ ایک کتاب اول تا آخر ختم ہوتی ہے تو اسی طرح کی دوسری کتاب شروع کر دی جاتی ہے۔ پھر دوسرے سال بھی انھی قواعد اور گردانوں کی دوسری کتابوں کا رٹا شروع ہو جاتا ہے جو آخر تک چلتا ہے۔ پھر تیسرے سال بھی اور چوتھے سال بھی جاری رہتا ہے اور اس سارے عرصے میں بچوں کو گرامر کے بے مقصد رٹے پر مجبور کیا جاتا ہے اور انھیں عربی زبان کی تعلیم نہیں دی جاتی۔'' (ص ۴۵۳)

''ہماری درس گاہوں میں اب تک کتابیں پڑھانے کا رواج چلا آ رہا ہے، جبکہ عصر حاضر میں دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے طریقہ تدریس میں بچوں کو فن پڑھانے اور زبان کو پڑھنے، لکھنے اور بولنے پر توجہ دی جاتی ہے۔ کتابوں کو جیسا تیسا پڑھا دینے سے بچوں کی صلاحیت اور مہارت میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہوتی، بلکہ قدیم نصاب میں تعلیم کے آغاز سے ہی بچوں کو بہت زیادہ درستی کتابوں (چھوٹی، بڑی اور طویل کتابوں) کی تدریس شروع کرا دی جاتی ہے۔ پھر یہ سلسلہ آخری جماعت تک جاری رہتا ہے۔'' (ص ۲۸۳، ۳۸۳)

اس تنقید کے برمحل ہونے کی ایک مثال یہ ہے کہ وفاق المدارس العربیہ کے نصاب میں شامل بعض کتابیں مفید ہونے کے باوجود غلط جگہ پر رکھے جانے کے باعث الٹا مشکل کا باعث بن جاتی ہیں۔ مثلاً نئے نصاب میں عربی نحو کی تمرین کے لیے ''المنہاج فی القواعد والاعراب'' کو ثانویہ عامہ سال اول میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں عربی جملوں کی فنی تحلیل جس سطح پر کی گئی اور اس کے لیے قرآن اور اشعار سے جن مثالوں کا انتخاب کیا گیا ہے، اس کے لحاظ سے اسے ''شرح جامی'' کے بھی بعد پڑھایا جانا چاہیے۔ موجودہ ترتیب میں اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ سادہ ہے۔ جب طلبا یہ کتاب پڑھتے ہیں تو ان کی وہ استعداد نہیں ہوتی جو زبان و بیان کے ان مباحث کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ ''شرح جامی'' پڑھتے کے بعد ہی وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ زبان کو اس درجے میں سمجھ سکیں اور ان مثالوں سے پوری طرح استفادہ کر سکیں جو اس کتاب میں دی گئی ہیں۔

موجودہ نصاب میں اس کمی کو دور کرنے کے لیے کافی عرصہ قبل ندوۃ العلماء کے بعض اساتذہ کی مرتب کردہ ''معلم الانشا'' شامل کی گئی تھی، تاہم یہ تجربہ حصول مقصد میں علی العموم ناکام رہا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اس کتاب میں بحیثیت مجموعی اردو سے عربی اور عربی سے اردو ترجمے کی مشق کے ذریعے سے انشاء سکھانے کی کوشش کی گئی ہے جو تعلیمی اصولوں کے لحاظ سے ایک فرسودہ اور تجرباتی طور پر ناکام طریقہ ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی بھی زبان میں اظہار مافی الضمیر کے لیے طالب علم کے پاس عربی الفاظ ومحاورات کا مناسب ذخیرہ ہونا چاہیے جنہیں وہ جملوں میں استعمال کرنے کی مشق کر سکے۔ ندوۃ العلماء لکھنو کے نصاب میں اسی وجہ سے ''معلم الانشاء'' کو عربی نظم ونثر کا اچھا خاصا ذخیرہ پڑھانے کے بعد رکھا گیا ہے، جبکہ ہمارے ہاں اس کتاب کی تعلیم بالکل ابتدائی درجات سے شروع کر دی جاتی ہے جب طالب علم ابھی عربی جملوں کی ساخت اور محاوروں سے مناسب طور پر مانوس نہیں ہوا ہوتا۔ چنانچہ عمومی مشاہدہ یہ ہے کہ طلبہ، دوران درس میں اساتذہ کی طرف سے لکھوایا گیا ترجمہ لکھ کر یا زبانی محفوظ کر لیتے ہیں اور امتحان میں وہی آموختہ دہرا کر کامیاب قرار پاتے ہیں۔

بابِ سوم

سفارشات

اہداف اور اغراض و مقاصد کا تعین

دینی نظامِ تعلیم کے اہداف

1۔ گزشتہ ابواب سے یہ واضح ہے کہ درس نظامی محض ایک نصاب نہیں بلکہ ایک مکمل دینی اور سماجی نظام اور تحریک کا نام ہے۔ اس لئے نصاب درس نظامی پر گفتگو کرتے ہوئے پہلے تو یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اس نظام کے اہداف اور اغراض و مقاصد کیا ہیں۔ اس کے اغراض و مقاصد سماجی، تحریکی، دینی یا تعلیمی نظام کے اعتبار سے مقرر ہوں گے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی یہ طے نہیں ہیں کیونکہ درس نظامی کے بارے میں جاری مباحث میں دینی مدارس سے فارغ التحصیل حضرات کے مندرجہ ذیل کام یا مناصب گنوائے جاتے ہیں:

- مساجد میں امامت اور مکاتب قرآن میں معلم کے فرائض
- علوم دینیہ کی حفاظت اور تدریس
- مسلمانوں کے عقیدہ اور دینی فکر کی حفاظت
- مسلمانوں میں اسلام مخالف رسوم و افکار کی اصلاح
- وعظ و ارشاد، تقریر و تحریر
- روزمرہ دینی مسائل میں لوگوں کی رہنمائی
- لوگوں کی دینی ضروریات میں مدد مثلاً جنازے، غسل میت، نکاح کی رسوم، شادی بیاہ کی رجسٹریشن وغیرہ

2۔ مندرجہ بالا فہرست میں دینی سماجی خدمات کے علاوہ، دینی تعلیم و تربیت بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ مساجد میں ایسے سیاسی امور بھی شامل ہیں جن میں مسلکی اور دینی معاملات پر نمازیوں کی رہنمائی کی جا سکے۔

3۔ تحریک اور نظام کے اعتبار سے بنیادی باتیں واضح نہیں کہ درس نظامی کے نصاب میں ان مقاصد کو کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔ بات زیادہ تر تعلیم اور تدریس کے بارے میں رہتی ہے۔ اس ضمن میں بھی درس نظامی کے طلباء کی تربیت زیادہ تر مدرسے کے ماحول اور اساتذہ کی ذاتی توجہ پر منحصر رہتی ہے۔

4۔ اغراض و مقاصد متعین ہوں تو ان کے حصول میں آسانی ہوتی ہے۔ اغراض و مقاصد عمومی، خصوصی اور تفصیلی تین مراحل میں طے کرنا ضروری ہیں۔ مثلاً کسی بھی علم اور فن کے عمومی مقاصد میں یہ متعین کیا جائے کہ اس علم اور فن کا درس نظامی میں کیا مقام ہے؟ اسکے اہداف کیا ہیں؟ ان کو کیسے حاصل کیا جائے۔ اس کے مقدمات اور مسلمات کیا ہیں؟ کیسے طے کئے جاتے ہیں؟ خصوصی اغراض و مقاصد میں یہ طے کرنا ہوگا کہ اس خاص علم اور فن کے لئے طلباء میں درس نظامی کے اعتبار سے کس استعداد کی ضرورت ہے؟ کن مہارتوں اور ملکات کی ضرورت ہے؟ اس کیلئے کیا نصابی سرگرمیاں درکار ہیں؟ اور تفصیل یا اغراض و مقاصد میں کسی علم کے لئے موضوعات کے نصاب کی تیاری کہ کونسی کتابیں، مقالات، اور مباحث شامل کئے جائیں، ہم نصابی سرگرمیاں کیا ہوں جیسے سوالات شامل ہیں۔ پھر ہر درس کے لئے اسی طرح کے سوالات اس کے تفصیلی اغراض و مقاصد طے کرتے ہیں۔

5۔ تعلیمی نظام کے اعتبار سے درس نظامی کے اہداف کے تعین کیلئے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ درس نظامی کے مدارس کا پاکستان کے عمومی تعلیمی نظام میں کیا کردار ہے: یہ نظام دوسری درسگاہوں کے متبادل ہے یا ذیلی؟ اضافی ہے یا تکمیلی؟ یا مستقل بالذات الگ نظام ہے۔ وفاق المدارس کے نظام کی موجودہ صورت حال کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ متبادل نظام ہے۔ اس میں قومی تعلیمی نظام کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ دینی نصاب کی ضرورتوں کو بھی پورا کیا جارہا ہے۔ مثلاً دینی مدارس اور دوسری درسگاہوں کے تعلیم مدارج کے مابین مندرجہ ذیل طریقے سے معادلت یا مساوات قائم کی گئی ہے۔ نصاب سازی بھی اسے اعتبار سے ہوگی تاکہ تکرار نہ ہو۔

دینی مدارس کے مدارج	مروجہ مدارج	دورانیہ
ابتدائیہ	پرائمری	۳سال
متوسطہ	مڈل	۵سال
ثانویہ عامہ	میٹرک	۳سال
ثانویہ خاصہ	ایف اے	۲سال
عالیہ	بی اے	۲سال
عالمیہ	ایم اے	۲سال

سفارشات

1۔ دونوں نظاموں یعنی درس نظامی اور مروجہ تعلیمی نظام کے مشترکات میں مضامین اور موضوعات کے تکرار کو ختم کیا جائے۔ دینی مدارس کے طلبا پر دوہرا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ مثلاً میٹرک کے درجے تک دونوں کا بنیادی نصاب ایک ہو اور امتحانی نظام بھی ایک ہو۔ البتہ درس نظام میں ثانویہ عامہ تک جو اضافی مضامین اور موضوعات پڑھائے جاتے ہیں وہ مروجہ تعلیمی نظام میں اختیاری مضامین کے طور پر دستیاب ہوں۔ اسی طرح سائنس کے مضامین مدارس کے طلبہ کے لئے اختیاری ہوں۔ مدارس اور سکولوں میں تعاون ہوتا کہ جن مدارس میں لیبارٹری کی سہولت میسر نہیں وہ سکولوں کی لیبارٹری سے فائدہ اٹھا سکیں۔

2۔ عمومی نظام تعلیم میٹرک کے نصاب کے اغراض و مقاصد یہ ہوتے ہیں کہ اس درجے میں طلبا اور طالبات کو بنیادی علوم وفنون سے متعارف کرادیا جائے اور ان ملکات اور مہارتوں کی تربیت دے دی جائے جو زندگی میں ضروری ہیں۔ درس نظامی کے اعتبار سے سفارش ہے کہ درجہ ثانویہ عامہ تک ان تمام علوم کی مبادیات اور ان تمام ملکات کی تربیت دے دی جائے جو درس نظامی کے نظام میں ایک عام مسلمان کی زندگی کے لئے لازمی سمجھی جاتی ہیں۔

3۔ اغراض و مقاصد پر بھی نظر ثانی ضروری ہے۔ یہ بھی سفارش کی جاتی ہے کہ وقتاً فوقتاً اس کا جائزہ لیا جائے اور اس بات کو بھی دیکھا جائے کہ کوئی گروہ اس نظام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کر سکے اور اس کے مطلوب مقاصد نظروں سے اوجھل نہ ہوں۔

نصاب سازی

علوم اور موضوعات کا تناسب

1۔ درس نظامی میں علوم اور موضوعات کا تناسب بھی تبدیل ہوتا رہا ہے۔ پہلے عربی زبان اور علوم عقلیہ یعنی منطق اور علم الکلام کا تناسب بہت زیادہ تھا جس کی وجہ سے علوم دینیہ کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دی جا سکتی تھی۔ موجودہ درس نظامی میں عربی زبان کے تناسب میں تو کمی نہیں کی گئی البتہ علوم عقلیہ کو کم کر کے علوم دینیہ کا تناسب بڑھا دیا گیا ہے۔ یہ تبدیلی خوش آئند ہے لیکن عربی زبان کا تناسب ۳۱ فیصد ہونے کے باوجود طلبا میں عربی زبان کے بولنے اور لکھنے کی استعداد پیدا نہیں ہوتی۔

سفارشات

1۔ اس ضمن میں سفارش ہے کہ زبان کے جدید طرز تدریس اپنانے سے عربی زبان کا تناسب کم کیا جا سکتا ہے۔ اور علوم دینیہ کا تناسب بڑھایا جا سکتا ہے۔

2۔ زبانوں کی تدریس ابتدائی درجات میں شروع ہو جانا ضروری ہے۔ اس درجے میں اردو، مقامی زبانیں، عربی، فارسی اور انگریزی بولنے، پڑھنے، لکھنے کی مہارت سکھائی جائے۔ گرامر کو متوسطہ درجوں اور ادب کو ثانویہ درجوں میں شروع کیا جائے۔ عربی زبان میں صرف اور نحو کی بنیادی تعلیم ثانویہ عامہ تک مکمل ہو جائے۔ تفصیلی تعلیم عربی زبان و ادب میں تخصص کے درجات میں دی جائے۔ لکھنے اور بولنے کو صرف و نحو اور بلاغت اور ادب سے الگ کر کے ابتدائی درجوں میں کر دیا جائے۔ زبان کی تدریس کے جدید طریقے کو رواج دیا جائے۔ جو گرامر کی تفصیلات میں جائے بغیر روز مرہ بول چال پر زور دیتا ہے۔ گرامر میں بھی جو باتیں بنیادی اور ضروری ہیں اور پڑھنے، لکھنے اور بولنے کے لئے ان کا جاننا لازمی ہے ان کو دیگر تفصیلات سے الگ کرنا ضروری ہے۔ اور صرف و نحو اور بلاغت کے لازمی اور تخصص دو درجے کر کے اس مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں عرب ممالک اور عربی زبان سکھانے کے اداروں کے تجربات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

3۔ زبانوں کی تدریس میں اردو اور فارسی کے علاوہ پاکستان کی مقامی زبانوں کو بھی شامل کیا جائے۔

علوم آلیہ

4۔ علوم عقلیہ میں بعض علوم آلیہ ہیں جیسے منطق اور بعض فکری جیسے فلسفہ اور کلام۔ درس نظامی میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ قدیم ہیں اور آج کی منطق اور فکر کا ساتھ نہیں دیتیں۔ یہ کتابیں جس وقت منتخب کی گئی تھیں وہ زمانے کے عصری تقاضوں کو پورا کرتی تھیں۔ علوم کے ارتقاء کی وجہ اب یہ کتابیں نہ صرف علمی طور پر ناکافی ہوگئی ہیں بلکہ ان کی بنیاد پر استدلال اور کلامی دفاع بھی مؤثر نہیں۔ درس نظامی کے اصول کے مطابق علوم آلیہ کی کتابوں کا انتخاب عصری ضرورتوں کے مطابق کیا جانا ضروری ہے۔

سفارشات

1۔ علوم آلیہ یعنی منطق اور عقلی استدلال کی تعلیم کے لئے جدید کتابوں کو داخل نصاب کیا جائے۔

2۔ منطق اور عقلی استدلال کی تربیت کے لئے علم الاختلاف کو بطور مضمون پڑھایا جائے۔

3۔ اصول فقہ کے جو ابواب استدلال اور اجتہاد سے تعلق رکھتے ہیں ان کو علوم آلیہ کے طور پر پڑھایا جائے۔

علوم عقلیہ

5۔ علوم عقلیہ کی افادیت علوم آلیہ کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ علوم عقلیہ کی مبادیات اور اصول علوم الٰہیہ اور علم الکلام میں علمی مسلمات کے اعتبار سے تسلیم کر لی گئی تھی۔

6۔ اس کے علاوہ بلاغت، سیاسیات اور دیگر علوم میں بھی یونان کے قدیم علوم کی کتابیں درس نظامی میں شامل کر لی گئیں۔ آج ان علوم میں اتنی ترقی ہوئی ہے کہ قدیم کتابیں نہ صرف ناکافی ہیں بلکہ ہمیں کائنات کو سمجھنے اور منطقی استدلال ترتیب دینے میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ ہمارے علم الکلام میں الجزء لایتجزی کو الٰہیاتی استدلال میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن نئی ایٹمی نظریات نے نہ صرف جزء لایتجزی کے مفروضے کی نفی کر دی ہے بلکہ ایٹم کو تقسیم کر کے ایک نئی کائنات دریافت کر لی ہے۔

7۔ علوم عقلیہ میں پڑھائی جانے والی میں قدیم سائنسی معلومات پر مبنی کلامی اور فقہی استدلالات آج کے ذہن

کے لئے ناقابل فہم ہیں۔ خصوصاً مابعد الطبیعیات کے اکثر مسلمات اب مسلمات نہیں رہے۔ نہ یہ آج کی معقولات ہیں۔ ان علوم کو درس نظامی کا حصہ بنانے سے نہ صرف یہ کہ یہ دین کا حصہ بن جاتے ہیں بلکہ طالب علم کے تصور کائنات کے اصول بن جاتے ہیں۔

سفارشات

1۔ علوم عقلیہ کے حوالے سے ایسی قدیم کتابیں جن کی معلومات سائنس اور علوم کے بارے میں اب پرانی ہو چکی ہیں یا متروک ہیں ان کو نصاب سے خارج کر دیا جائے۔ ان کی جگہ جدید کتابیں داخل نصاب کی جائیں۔ اس میں عرب ملکوں میں علوم عقلیہ کے نصابات سے مدد لی جاسکتی ہے۔

2۔ علوم عقلیہ کو تخصصات، ایم اے میں رکھا جائے۔ ان مضامین کی تدریس میں جامعات اور مدارس میں تعاون اور اشتراک کے امکان پر غور کیا جائے۔

3۔ مزید برآں سماجی علوم درس نظامی میں یا تو سرے سے شامل نہیں یا شامل ہیں تو ضمنی حیثیت سے۔ تاریخ، عمرانیات، بشریات، فلسفہ علوم اور علم نفسیات کو شامل کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔

علوم دینیہ

1۔ علوم دینیہ کو علوم نقلیہ بھی کہا جاتا ہے تاکہ ان کو علوم عقلیہ سے ممیّز کیا جا سکے۔ اس لئے کہ دونوں کے اصول، مناہج استدلال اور مسلمات میں فرق کیا جاتا ہے۔ اسی لئے ان کی نصاب سازی اور اغراض و مقاصد میں بھی فرق ہے۔ تاہم تناسب اور دورانیے کے اعتبار سے ان پر کما حقہ توجہ نہیں دی جاسکی۔ درسِ نظامی کے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے اس کے منتہی کو علوم دینیہ پر اتنا عبور ہونا چاہئے کہ وہ اجتہاد کے اہل ہو اور اس کی شرائط پوری کرتا ہو۔ کسی فقہی مذہب کا مقلد ہوتے ہوئے بھی ایک عالم کے لئے اجتہاد کی مطلوبہ بنیادی شرائط پر پورا اترنا لازمی ہونا چاہئے۔

2۔ قرآن مجید اور حدیث علوم دینیہ کے بنیادی مصادر ہیں۔ علم فقہ، علم الکلام تخصصات میں شمار ہوتے ہیں۔ تاہم قرآن مجید اور حدیث پر اتنا کام ہو چکا ہے کہ علوم القرآن اور علوم الحدیث کی باقاعدہ تدریس ضروری ہے۔ اسی طرح علم فقہ میں بھی اصول فقہ کے علاوہ متعدد علوم تدوین پا چکے ہیں۔

3۔ درس نظامی میں علوم دینیہ کی تدریس میں توجہ مبادیات پر مرکوز رہتی ہے۔اس لئے اکثر طلبا میں متوقع ذہنی وسعت اور علمی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی جو آج کی ضرورت ہے۔

سفارشات

1۔ دینی کتب کی تدوین، ان کتابوں کی نوعیت (مختصر، مطول، مبسوط، شرح، حاشیہ، ذیل، تکملہ وغیرہ)، ان کی درجہ بندی (اصل، اصول، نوادر وغیرہ)، کتاب کے موضوعات کی ترتیب، ان کتابوں کی تدریس و تالیف، فہارس، مکتبات، لغت اور تراجم کی کتب، مخطوطات، وغیرہ کا تعارف نصاب میں شامل کیا جائے۔

2۔ کتاب پڑھنے کی مہارتیں درجہ ثانویہ میں متعارف کرادی جائیں۔مثلاً کتابوں کے اہم نکات لکھنا، خلاصہ تیار کرنا، تبصرہ اور تنقید، اغلاط کی نشاندہی وغیرہ۔

3۔ کتاب کی تدریس کے وقت اس کے مصنف، اور متعلقہ علم یا فن میں اس کتاب کا مقام، اس کی تاریخ، اس کے مصادر وغیرہ کا تعارف بیان ضروری ہے۔

4۔ علوم القرآن میں قرآن کریم کی تاریخ اور اصولی اور تاریخی مباحث کو نصاب میں شامل کیا جائے۔متن قرآن، رسم المصحف، اور اختلافات قرأت پر جدید تحقیقات سے روشناس کرایا جائے۔

5۔ اصول تفسیر کو باقاعدہ علم کے طور پر شامل کیا جائے۔تفسیر کی تدریس میں تفسیر کے مناہج پر روشنی ڈالی جائے۔ تفسیر کے مدارس سے متعارف کرایا جائے۔مفسرین کے اختلافات اور ان کے دلائل سے روشناس کرایا جائے۔

6۔ قرآن کریم اور تفسیر کے بارے میں جدید مباحث اور رجحانات، حالیہ تحقیقات اور تفسیری ادب سے متعارف کرایا جائے۔

7۔ قرآن کریم سے متعلق تحقیقی کام کے لئے جو آسانیاں پیدا ہوئی ہیں، اس کے اشاریے، ویب سائٹ، اور دوسرے تکنیکی وسائل سے واقف کرایا جائے۔

8۔ علوم حدیث میں مختلف رجحانات، مباحث اور نئی تالیفات سے متعارف کرایا جائے۔جرح وتعدیل کے علاوہ نقد متن حدیث اور دیگر علوم سے متعارف کرایا جائے۔

9۔ تدوین حدیث کی تاریخ، مدارس تدوین اور حالیہ کوششوں سے روشناس کرایا جائے۔

10۔ علم فقہ کی تدریس میں مختلف فقہی مذاہب کی کتابوں کو شامل کیا جائے۔

11۔ علم الفقہ کے ارتقا اور تاریخ سے روشناس کروایا جائے۔

12۔ فقہی کتب کی تدریس کے وقت فقہا کے اختلافات کو معروضی طور پر پیش کیا جائے۔ ان کے دلائل اور استدلال کو انہی کے مذہب کے لحاظ سے بیان کیا جائے۔

13۔ علوم فقہ کی تمام شاخوں کو نصاب میں شامل کیا جائے۔

14۔ اصول فقہ کو الگ مضمون کے طور پر پڑھانے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ فروع فقہ کی تدریس کے وقت متعلقہ اصول فقہ بھی بیان کئے جائیں۔

15۔ علم الفقہ کی تدریس میں فتاوی کی تاریخ، اصول اور آداب سے بھی متعارف کرایا جائے۔

16۔ طلبا کو عصری قانونی نظام، آئین، عدالتی نظام، بین الاقوامی قوانین سے روشناس کرایا جائے۔

17۔ فقہی موضوعات کی تعلیم میں فتاوی، قضاۃ کے فیصلوں اور حکمرانوں کے فرامین پر بحث کو شامل کیا جائے۔ دور حاضر میں مختلف ممالک میں جو قانون سازی ہوئی ہے اس سے بھی متعارف کرایا جائے۔

دیگر سفارشات

1۔ دینی اور اخلاقی تربیت پر زور دیا جائے۔

2۔ تدریس کے لئے محاضرات کے علاوہ دوسرے طریقے بھی اختیار کئے جائیں۔ محاضرات کتاب کی بجائے موضوعات کو مرکز بحث بنائیں۔

3۔ تدریس میں سوال و جواب کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

4۔ علوم و فنون کی تدریس کے ساتھ ملکات اور مہارات کو بھی شامل نصاب کیا جائے۔ ان میں تحریر و تقریر، استدلال، تنقید و تبصرہ وغیرہ شامل ہیں۔

5۔ سائنسی مضامین، جدید علوم اور امتحانات کے حوالے سے دینی مدارس اور جامعات میں اشتراک اور تعاون کو

فروغ دیا جائے۔

6۔ تحقیق وتحریر کی تربیت کے لئے اجتماعی تحقیقی منصوبوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔طلبا کی مختلف ملکی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کوفروغ دیا جائے۔

7۔ درس نظامی کے طلباء میں انتظامی اہلیت پیدا کرنے کے لئے خصوصی عملی تربیت دی جائے۔جس میں انتظامی امور، نظم وضبط کے اصول اور قوانین، بجٹ، حسابات، آڈٹ اور اکاؤنٹ شامل ہوں۔

8۔ تخصصات کے طور پر درس نظامی کے طلبا کو تدریس، خطابت، افتا اور قضا کے شعبوں میں مہارت کے حصول کے لئے الگ سے عملی تربیت دی جائے۔

مراجع ومصادر

کتب

1۔ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، سید مناظر احسن گیلانی، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، سن ندارد

2۔ تعلیمات، سید ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء

3۔ خطبات آزاد، مرتبہ: مالک رام، نئی دلی، ساہتیہ اکادیمی، ۱۹۹۰ء

4۔ درس نظامی کی اصلاح اور ترقی، مولانا محمد بشیر سیالکوٹی، اسلام آباد، دارالعلم، مئی ۲۰۱۳ء

5۔ دینی مدارس میں تعلیم: کیفیت، مسائل، امکانات، مرتب: سلیم منصور خالد، اسلام آباد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ۲۰۰۲ء

6۔ دینی مدارس کا نصاب و نظام: نقد و نظر کے آئینے میں، گوجرانوالہ، ابوعمار زاہد الراشدی، الشریعہ اکادمی، ۲۰۰۷ء

7۔ دینی مدارس اور عصر حاضر، مرتب: شبیر احمد خان میواتی، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ، ۲۰۰۷ء

8۔ علماء دیوبند کی علمی اور مطالعاتی زندگی، مرتب: مولانا عبدالقیوم حقانی، القاسم اکیڈمی نوشہرہ، بار چہارم، ۲۰۰۷ء

9۔ محاضرات تعلیم، ڈاکٹر محمود احمد غازی، کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء

10۔ ہمارا تعلیمی نظام، مولانا محمد تقی عثمانی، کراچی، مک دارالعلوم، ۱۴۱۵ء

11۔ ہمارا دینی نظام تعلیم، ڈاکٹر محمد امین، دارالاخلاص لاہور، جولائی ۲۰۰۴ء

12۔ ماہنامہ الشریعہ، خصوصی شمارہ بر تعلیم، جولائی ۱۹۹۶ء

13۔ عبدالحی حسنی لکھنوی، نزہۃ الخواطر

14۔ اختر راہی، تذکرہ مصنفین درسِ نظامی، لاہور، مکتبہ رحمانیہ

15۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، لاہور، مکتبہ رحمانیہ

16۔ آئینہ و آئین و قواعد، ملتان، خیر المدارس

17۔ Metcalf, Barbara Dely, *Islamic Revival in British India: Deoband 1860-1900,* Karachi, Royal Book Company, 1982

18۔ Zaman, Muhammad Qasim. *The Ulama in Contemporary Islam: Custodians of Change.* Princeton University Press. 2002

تجزیاتی مطالعات

1۔ اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام ''پاکستان میں مطالعہ قرآن کی صورت حال'' کے عنوان پر تین روزہ کانفرنس کی سفارشات وتجاویز http://daily.urdupoint.com/livenews/2014-12-03/news-335267.html

2۔ ''پاکستانی جامعات میں قرآنیات کا مطالعہ''، ڈاکٹر حافظ محمود اختر، الشریعہ، جنوری ۲۰۱۴ء ''تخصص تدریب المعلمین برائے مدارس دینیہ''، الشریعہ، اگست ۲۰۰۳ء http://www.alsharia.org/mujalla/2003/aug/akhbar-asar

3۔ ''تدریس حدیث اور عصر حاضر کے تقاضے''، مولانا مفتی محمد زاہد، الشریعہ، مئی جون ۲۰۰۹ء

4۔ ''تدریس حدیث کے چند اہم تقاضے''، ابو عمار زاہد الراشدی، الشریعہ، مئی جون ۲۰۰۹ء

5۔ ''دینی مدارس میں تخصص اور اعلیٰ تعلیم وتحقیق''، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ماہنامہ الشریعہ، جنوری ۲۰۰۸ء

6۔ ''دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم اور نظام تعلیم وتربیت''، از: مولانا شوکت علی قاسمی بستوی، استاد دارالعلوم دیوبند وناظم عمومی رابطہ مدارس اسلامیہ (۱۲ اقساط) http://darululoom-deoband.com/urdu/articles/index.php?content=categories&display=detail262
http://darululoom-deoband.com/urdu/articles/index.php?

content=categories&display=detail&id=273

7۔ درس نظامی کے نصاب اور اصول نصاب سازی کا جائزہ''،

http://sadaemuslim.com/2013/04/blog-post.htm

8۔ ''دینی مدارس میں قواعد فقہ کی تعلیم''، مولانا اشتیاق احمد قاسمی، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، شمارہ 2، جلد: 94 صفر –ربیع الاول 1431ھ مطابق فروری 2010ء)- http://www.daululoom

deoband.com/urdu/articles/index.php?content=

categories&display=detail&id=13

9۔ ''دینی مدارس کے نصاب کی تشکیل جدید: فقہی مواد کا خصوصی جائزہ''، ڈاکٹر قبلہ ایاز، ماہنامہ تجزیات، ۲۰۰۹ء کا شمارہ نمبر ۷، http://www.tajziat.com/issue/2009/07

detail.php?category=taj&id=5

10۔ ''دینی مدارس میں تدریس حدیث''، مولانا اشہد رفیق ندوی،

http://zindgienau.com/Issues/2010/june2010

/images/unicode_files/heading6.htm

11۔ ''دینی مدارس کے لیے تدریب المعلمین اور تخصصات دینیہ کا نظام'' (آئی پی ایس کے زیر اہتمام مذاکرہ)، الشریعہ، مئی جون ۲۰۰۹ء

12۔ ''علم الکلام اور اس کے جدید مباحث''، ابوعمار زاہد الراشدی، الشریعہ، اپریل ۲۰۱۳ء

13۔ ''مجلس فکر و نظر کا منظور کردہ نصاب اور سفارشات''، ماہنامہ الشریعہ، مارچ ۲۰۰۲ء

http://www.alsharia.org/muhalla/2002/mar/madaris

-nisab-safarishaat

14۔ http://www.bzu.edu.pk/PJSS/Vol32No12012/Final_PJSS-32-1-11.pdf

ABOUT
PEAD Foundation

Peace Education And Development (PEAD) Foundation is a non-profit, non-political organization with over 14 years of expertise and experience as a rights-based, research, training and advocacy organization. Founded in 2002 with a focus on de-radicalization and counter-extremism efforts, PEAD Foundation has a national level presence in 25 districts and is dedicated to working on its core focus areas; human rights, peacebuilding, democracy and governance, interfaith harmony and social cohesion. PEAD Foundation partners with national and international organizations for achieving its vision which is; to promote a peaceful, democratic and sustainable Pakistan.

http//: www.pead.org.pk
Email: info@pead.org.pk
Facebook/peadfoundation
Twitter@PEADFoundation